فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	5
انوار ربانی	قرآن میں بیان دو انسانی نمونے	فوزیہ سعید	7
قولِ نبیؐ	غصہ پی جانا	مسز سیف اللہ	11
خاص مضمون	میرے آغا جان	ڈاکٹر سمیحہ راحیل قاضی	14
	پھیلتا ہوا اسلام	قاضی حسین احمد	17
نوائے شوق	اُس کا شکر	شمیم فاطمہ	21
	غزل	نجمہ یاسمین یوسف	21
	غزل	شہود ہاشمی	22
	غزلیہ	شمیم فاطمہ	22
حقیقت وافسانہ	ریوڑ	ام ایمان	23
	پھر اس کے بعد کا منظر	قانتہ رابعہ	27
	لو میرج	ڈاکٹر شگفتہ نقوی	30
	ہم ہیں صبحِ امید	حفصہ محمد افضال	34
سلسلہ وار کہانی	کہیں چاند راہوں میں کھو گیا	نصرت یوسف	37
سفرِ سعادت	مزدلفہ میں آمد اور روانگی	قانتہ رابعہ	44
سارا جہاں ہمارا	نیل کے ساتھ ساتھ روشنی کا سفر	ڈاکٹر رخسانہ جبین	48
نمایاں خواتین	ملکہ سبا	آسیہ راشد	59
رپورتاژ	انقلاب کی بات کرتے ہو!	نگہت یاسمین	65
نہاں خانۂ دل	تجھ سا لاؤں کہاں سے	افشاں نوید	67
قدرت کے خزانے	پانی ضائع نہ کریں	شہناز یونس	70
بتول میگزین	ثناء عزیز، حمیرا ثاقب، طاہرہ کامران، فرح ثناء اللہ، طوبیٰ احسن		72
محشرِ خیال			75
گوشۂ تسنیم	مشترک بات کی طرف	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	79
انتخاب	ایک کپ کافی دیوار پر	مرسلہ: فرح فاروق	80

ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام! مہمان سردی دبے پاؤں کھسک رہی ہے اور بہار کی آمد ہے۔ دلِ عشاق اور الرجی کے مریضوں ......دونوں کی خبر رکھنے کی ضرورت ہے کہ

؎ پھول کھلتے ہیں ان مہینوں میں!

ویسے بھی شہر لاہور کو جس طرح پلوں اور پھولوں سے بھر دیا گیا ہے، اسے دیکھ کر گھڑی بھر کو ہی سہی، ''سب اچھا'' مان لینے کو دل چاہتا ہے۔ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ہم ایسے ملک میں ہیں جہاں بجلی ہسپتالوں کو بھی پوری نہیں پڑتی، گیس چولہے گرم کرنے تک سے قاصر ہے، پٹرول، گوشت کی طرح غریب کی پہنچ سے باہر ہے اور سی این جی کے لیے قطاریں بلا مبالغہ کلومیٹروں میں ہیں، یا ہوتی ہی نہیں۔ اچھا ہوتا اگر اتنے بھاری بجٹ پر مبنی منصوبوں کا بوجھ عوام پر نہ ڈالا جاتا۔

ہزارہ کمیونٹی کا دوسری بار قتل عام انتہائی دلدوز اور شرمناک سانحہ ہے۔ سندھ اور بلوچستان میں بدامنی کی آگ بھڑکا کر ملک دشمن عناصر اپنے مذموم عزائم پورے کرنے میں مصروف ہیں اور حکومت تماشا دیکھ رہی ہے۔ بلکہ وزرائے باتدبیر دکھی لوگوں کے زخموں پر نمک چھڑکنے والے بیانات دے رہے ہیں۔ ''وزیراعظم نے سخت نوٹس لے لیا''، ''صدر نے دلی افسوس کا اظہار کیا'' اور ''جائزہ لینے کے لئے کمیٹی بنا دی گئی۔'' جیسی باتوں سے آگے بات نہیں بڑھتی۔ ٹارگٹ کلنگ اسی طرح جاری ہے کراچی میں ہر روز آٹھ دس لاشیں گرنا معمول ہے۔ بلکہ اب اس کا دائرہ لاہور تک آ پہنچا جب ایک ڈاکٹر کو کمسن بیٹے سمیت گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا۔ پرامن شہریوں میں اس طرح ظلم کے ذریعے فساد اور انتقام کے شعلے بھڑکانا واضح ملک دشمنی ہے اور صوبائی و وفاقی حکومتوں پر اس کی بنیادی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

انتخابات سر پر ہیں۔ سیاسی جماعتوں کا جوڑ توڑ جاری ہے۔ ڈوبتی کشتی سے چھلانگیں لگانے کے مناظر

دلچسپ ہیں۔ایم کیوایم کے اسمبلیوں سے استعفے بھی ایک مزیدار خبر ہے۔5 سال اقتدار کے مزے لوٹتے ہوئے بھی لب ولہجہ حزبِ مخالف کا سا رکھنا، اور پھر مہینہ بھر پہلے ''احتجاجاً'' استعفے دے کر حکومت سے الگ ہوجانا، سیاست کی یہ ادائیں کچھ انہی سے خاص ہیں۔گزشتہ پانچ سالوں کی کارکردگی نے حکومتی جماعت کے تو امکانات بے حد محدود کر دیئے ہیں۔بقول افتخار عارف:

؎ تیری شوریدہ مزاجی کے سبب تیرے نہیں
اے مرے شہر ترے لوگ بھی اب تیرے نہیں
میں نے اک اور بھی محفل میں انہیں دیکھا ہے
یہ جو تیرے نظر آتے ہیں یہ سب تیرے نہیں

امید ہے کہ الیکشن وقت پر اور آزاد الیکشن کمیشن کے تحت منصفانہ ہوں گے۔جاگیردارانہ سیاست کے شکار علاقوں کو چھوڑ کر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس بار ووٹ دینے والوں سے بھی امید ہے کہ وہ نمائندوں کے چناؤ میں ماضی کی نسبت بہتر شعور کا مظاہرہ کریں گے۔

گوادر کی بندرگاہ کا ترقیاتی کام چین کو دینے کا فیصلہ بظاہر ہمارے قومی مفادات کے مطابق ہے۔ویسے بھی آزمودہ فارمولے کے مطابق جو اقدام امریکی اور بھارتی مفادات کے خلاف ہو وہ عموماً پاکستان کے حق میں ہوتا ہے۔ایران سے گیس پائپ لائن کا منصوبہ طے پا جانا بھی خوش آئند اقدام ہے۔مگر بدامنی، دہشت گردی اور ٹارگٹ کلنگ ہمارے خوشحال مستقبل کے امکانات پر ایک بڑا سوالیہ نشان بن کر ثبت ہو گئے ہیں۔گزشتہ دنوں منگلا اور تربیلا پاور ہاؤسز کا یک لخت ایک ساتھ فیل ہو جانا پورے ملک کو تاریک کر گیا۔موجودہ سیکیورٹی کے حالات میں یہ ایک نہایت فکر انگیز صورتحال ہے۔وجوہات ابھی تک نامعلوم ہیں جبکہ دہشت گردی کے امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا۔دہشت گردی کی اس نا سعد جنگ کے کڑوے پھل آج ہمارے حال کے ہر موڑ پر اگ رہے ہیں اور قومی زندگی کے ہر پہلو کو اپنے زہر سے آلودہ کر رہے ہیں۔مارچ قراردادِ پاکستان منظور ہونے کا مہینہ ہے۔آیئے 23 مارچ اس عزم کے ساتھ منائیں کہ اس ملک کی سلامتی پر

کوئی آنچ نہ آنے دیں گے۔انشاءاللہ

گزشتہ شمارہ (فروری) میں صفحہ 29 پر نظم ''قول وعمل کا غازی'' محترمہ نجمہ یاسمین یوسف کی تخلیق تھی جس پر سہواً ان کا نام درج ہونے سے رہ گیا۔قارئین نوٹ فرمالیں۔

طالبہ دعا

صائمہ اسما

قرآن مجید میں بیان دو انسانی نمونے

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کئی مقامات پر ایمان وعمل کے لحاظ سے دو انسانی نمونوں کا ذکر کیا۔ سورۃ الّیل میں اللہ نے جس اسلوب میں انسانی زندگی کے دو بالکل مختلف نمونوں کا تذکرہ کیا ہے وہ ملاحظہ کیجئے۔

سورت کا آغاز ''قسم'' سے کیا گیا اور اردو زبان کی طرح عربی زبان میں بھی جب کسی بات کا یقین دلانا ہو اور اسکی اہمیت واضح کرنا ہو تو گفتگو اور تحریر کا آغاز ''قسم'' سے کیا جاتا ہے۔ اللہ جل جلالہٗ نے قرآن مجید میں اسی متعارف عندالعرب، اسلوب کو استعمال کیا ہے۔

عام طور پر ''قسم'' اس چیز کی کھائی جاتی ہے جس سے سننے والا اچھی طرح واقف ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے کلام کے آغاز میں چار بالکل متضاد چیزوں کی قسم کھائی اور ایسی چیزیں کہ ہر انسان عاقل وبالغ ان پڑھ اور جاہل ہر روز ہر وقت ان کا مشاہدہ کرتا ہے۔ فرمایا گیا۔

(ترجمہ): ''قسم ہے رات کی جب کہ وہ چھا جائے۔'' اس کے بالمقابل دوسری قسم جس پر کھائی وہ ہے'' دن کی جب کہ وہ روشن ہو جائے۔'' دن اور رات کا ہر انسان ہر روز مشاہدہ کرتا ہے۔ اور اس کے فرق کو بھی بہت اچھی طرح غنیث ہے کہ دن میں ہر چیز روشن اور واضح کر دی جاتی ہے اور یہ کام کاج کا وقت ہوتا ہے۔ اور رات سے ہر چیز کو ڈھانپ دیا جاتا ہے اور یہ راحت وسکون کے حصول کا باعث ہے۔ چنانچہ یہ بات سمجھ میں آگئی کہ دن اور رات دو بالکل متضاد اوقات ہیں۔

اگلی آیت میں جن دو بالکل متضاد اور مختلف مخلوقات کا ذکر کیا گیا ہے وہ ہیں'' اور قسم ہے اس ذات کی جس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا۔'' اللہ جَلَّ شانہٗ نے اس آیت میں اپنی ذات کی قسم کھا کر دو متضاد مخلوقات نر اور مادہ کا تذکرہ کیا۔ قرآن مجید میں کئی دوسرے مقامات پر اس بات کی وضاحت ملتی ہے کہ کائنات کی ہر چیز کو اللہ نے جوڑوں (نر و مادہ) کی شکل میں پیدا کیا۔ انسان،

جانور، چرند پرند حتیٰ کہ درخت اور پودے بھی۔

آیت نمبر 4 میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے فرمایا: ''تمہاری کوششیں یقیناً مختلف قسم کی ہیں۔'' یعنی جس طرح رات اور دن مختلف ہیں، نر اور مادہ مختلف ہیں اسی طرح تم میں سے ہر انسان ہر وقت کسی نہ کسی کوشش میں مصروف ومشغول ہے۔ انسانوں کی کوششیں بھی دو طرح کی ہیں اور وہ یہ ہیں: ''پھر جس نے اللہ کی راہ میں مال دیا اور پرہیزگاری اختیار کی او ربھلی باتوں کی تصدیق کی تو ہم اسے آسان راستے پر چلنے کی سہولت دیں گے۔''

ایمان وعمل کا ایک نمونہ یہ ہے۔ مختصر اور جامع الفاظ میں اس نمونے کی تین خوبیاں بیان کی گئی ہیں:

۱۔ اللہ کے دیے ہوئے مال واسباب کو اللہ کی رضامندی اور دین کی سربلندی کے کاموں میں خرچ کرتا ہے۔

۲۔ زندگی محتاط اور چوکنا رہ کر گزارتا ہے کہ کوئی کام اور کوئی بات اللہ کی مرضی کے خلاف نہ ہو جائے۔ دھیان رکھتا ہے کہ میرے کان کیا سن رہے ہیں، میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں، میری زبان کیا بول رہی ہے، میرا ذہن کیا سوچ رہا ہے، میرا دل کیا محسوس کر رہا ہے، میرے ہاتھ کیا لے رہے ہیں اور کیا دے رہے ہیں، میرے قدم کس طرف اٹھتے ہیں اور کس راستے سے رک جاتے ہیں۔

۳۔ اس ماڈل کی تیسری خوبی یہ بتائی گئی ہے وہ شخص ہر بھلی بات کی تصدیق کرتا ہے۔ بھلی بات سے مراد ایمان بالغیب بھی ہے۔ اللہ کی آیات بھی ہیں۔ اللہ کی توحید بھی، رسالت کی تصدیق بھی اور اخلاق فاضلہ کی بجا آوری بھی۔

ان تین خوبیوں کے پیدا کرنے والے انسان کو دنیا میں انعام کے طور پر یہ بشارت دی گئی ہے کہ ''ہم اسے آسان راستے پر چلنے کی سہولت دیں گے۔'' اس سے مراد یہ ہے کہ ان تین خوبیوں کی برکت سے شریعت کے باقی تمام احکامات پر چلنا اسکے لئے آسان بنا دیا جائے گا۔

اس کے بالمقابل جو دوسرا ماڈل پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے: ''اور جس نے بخل کیا اور بے پروا بنا رہا اور بھلائی کو جھٹلایا تو ہم اسے تنگی کی راہ پر چلنے کی سہولت دیں گے اور جب وہ جہنم کے گڑھے میں گرے گا تو اس کا مال اس کے کسی کام نہ آئے گا۔''

پہلے ماڈل کی تین خوبیوں کے متضاد اس ماڈل کی

تین خامیاں یوں بیان کی گئیں۔

ا۔ اللہ تعالیٰ کے دیئے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بجائے وہ مال کو بچا بچا کر اور سینت سینت کر رکھتا ہے اور بخل کرتا ہے اسی کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا: ''ہر صبح دو فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہتا ہے: اے اللہ! خرچ کرنے والے کو اس کے عوض اور مال دے۔ اور دوسرا کہتا ہے: اے اللہ! بخل کرنے والے کے مال کو تلف کر دے۔'' (صحیح بخاری)

۲۔ تقویٰ پرہیزگاری اور محتاط رویہ کے متضاد رویہ ہے کہ بالکل اس بات کی پروا نہ کرنا کہ میرا کوئی خالق و مالک بھی ہے اس کی رضامندی اور ناراضی کی پروا کیے بغیر قول وعمل میں غیر محتاط رویہ روا رکھنا۔

۳۔ ہر بھلی بات کو غیر اہم اور غیر ضروری سمجھ کر غور وفکر کیے بغیر جھٹلا دینا۔

اللہ تعالیٰ نے اس ماڈل کے لئے سزا کے طور پر دنیا میں ان تین خامیوں کی وجہ سے شریعت کے باقی احکام پر عمل کرنا مشکل بنا دیا۔ گویا کہ بھلی بات کی تصدیق کرنا، اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اور پرہیزگاری اختیار کرنا وہ ثمر بار اعمال ہیں کہ دوسرے نیک اعمال کے راستے کھول دیتے ہیں اور یہ بنیادی عمل بجا نہ لائے تو باقی نیک اعمال سے بھی محروم ہو گئے۔

مال و اسباب کو خرچ نہ کرنے اور بخل کی تحقیر اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں کی ''جب وہ جہنم کے گڑھے میں گرے گا تو اس کا مال اس کے کچھ کام نہ آئے گا۔'' اس حقارت آمیز جملے میں گویا یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ نادان! جو چیز آئندہ مشکل وقت میں تمہارے کام آنے والی نہیں۔ اسے کیوں بچا بچا کر اور سنبھال سنبھال کر رکھ رہے ہو۔

جس طرح دن اور رات اور نر و مادہ ایک دوسرے سے مختلف و متضاد ہیں اسی طرح یہ دو ماڈل بھی۔ اور ان کا انجام بھی۔ لیکن ان کے انجام کا ذکر کرنے سے پہلے اللہ جل جلالہٗ نے دونوں ماڈلز کو مخاطب کر کے انتہائی محبت، شفقت اور مہربانی سے فرمایا: ''بلاشبہ ہدایت دینا ہمارے ذمے ہے۔'' دونوں نمونوں کے لوگوں کو خیر خواہانہ مخاطب کر کے متنبہ کیا کہ اس بھڑکتی ہوئی آگ میں کون ڈالا جائے گا؟

''اس میں وہی گرے گا جو بڑا بدبخت ہو۔ جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔''

تین وجوہات کی بنا پر وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں جا گرے گا۔

۱۔ بد بخت ہونا۔

۲۔ حق بات کو ماننے سے انکار کرنا، اس کو جھٹلا دینا۔

۳۔ بھلی باتوں سے منہ پھیرنا۔

اس سزا اس سے بچایا کس کو جائے گا؟

''وہ جو بڑا پرہیز گار ہوگا اسے اس سے دور رکھا جائے گا۔ جس نے پاکیزہ ہونے کی خاطر مال دیا۔''

جن خوبیوں کی بنا پر وہ بھڑکتی ہوئی آگ سے دور رکھا جائے گا وہ پہلے ماڈل والی خوبیاں ہیں۔

۱۔ تقویٰ کی زندگی گزارنا یعنی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ناراضگی سے بچنا اور ان کاموں سے دور رہنا جو جہنم میں ڈالنے والے ہیں۔

۲۔ نفس کو پاک کرنے اور مال کو پاک کرنے کے لیے مال سے مقررہ مقدار نکال کر ضرورت مندوں میں تقسیم کر دینا ہے۔

آخری تین آیات میں اس ماڈل کی فی سبیل اللہ خرچ کرنے کی خوبی کو اللہ تعالیٰ نے جس اسلوب میں سراہا ہے وہ سننے اور غور کرنے سے تعلق رکھتا ہے ملاحظہ کیجیے: ترجمہ ''اس پر کسی کا کوئی احسان نہ تھا کہ جس کا وہ بدلہ چکاتا بلکہ اس نے تو رب برتر کی رضا کے لئے مال خرچ کیا۔ اور جلد ہی وہ خوش ہو جائے گا۔''

گویا خرچ نہ کرنے والوں اور بخل کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ خرچ کرنے والے عمل سے ترغیب دلا رہے ہیں کہ تم بخل کرتے ہو اور وہ رب کی راہ میں خرچ اس لیے نہیں کرتا کہ اس پر کسی کا پہلے سے کوئی احسان تھا اور اس احسان کا بدلہ چکا رہا ہے بلکہ وہ تو صرف اللہ رب العزت کی رضا اور خوشنودی کے لئے خرچ کر رہا ہے۔ رضا و خوشنودی کے الفاظ بہت خوبصورت استعمال ہوئے ہیں ''اِبۡتِغَآءَ وَجۡہِ رَبِّہِ الۡاَعۡلٰی''

اپنے رب جو دنیا و مافیہا سے اعلیٰ اور ارفع ہے اس کا چہرہ چاہتا ہے، قرآن پاک میں ''لَا یُنۡظُرُ الیھم ولا یزکیھم'' کے الفاظ سے اللہ کی ناراضگی کا اظہار ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوں گے جن کی طرف اللہ دیکھے گا بھی نہیں اور نہ ہی انہیں پاک کرے گا۔ یعنی ان کی طرف سے منہ پھیر لے گا۔ اس کے بالمقابل رضا مندی کے لئے اللہ تعالیٰ کا کسی شخص کی طرف اپنا چہرہ کر لینا اس کی رضا ہے۔

اور ''انعام'' کا اعلان اتنی بے نیازی سے کیا کہ دل میں نقش ہو گیا ہے۔ وَلَسَوۡفَ یَرۡضٰی ''اور عنقریب وہ اس سے راضی ہو جائے گا۔''

اس سے بڑی خوش خبری کسی بندہ مومن کے لئے ہونہیں سکتی کہ اللہ اسے اس کی زندگی میں ہی اپنی رضا مندی اور مزید انعامات کی بشارت دیں۔ اب چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے اس کے کانوں میں یہ گونج سنائی دے:

''اے نفس مطمئن! لوٹ اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تیرا رب تجھ سے راضی ہے اور تو اپنے انجام سے۔ داخل ہوجا میری جنت میں داخل ہوجا میرے بندوں میں۔تو وہ بالکل حق بجانب ہے۔''

متعدد روایات میں اس پر شاید ہیں کہ یہ آیات حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ آزاد مردوں میں سب سے پہلے ایمان لائے۔ کپڑے کا کاروبار کرتے اور مال دار تھے۔ ابتدائے اسلام میں جو غلام ایمان لے آتا تو وہ اپنے آقا کے ہاتھوں ظلم وتشدد کا نشانہ بنتا جو نبی مہربان حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے برداشت نہ ہوتا چنانچہ آپؐ حضرت ابوبکرؓ سے فرماتے کہ اسے خرید کر آزاد کردو۔ اس طرح آپؓ نے سترہ غلاموں کو آزاد کروایا۔ اسلام اور اشاعت اسلام کی خاطر کبھی بھی مالی قربانی سے دریغ نہ کیا۔ سیدنا ابوبکرؓ کی ان قربانیوں کا نبیؐ نے برملا اعتراف کیا۔ حدیث ملاحظہ کیجیے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس بیماری میں آپؐ نے انتقال فرمایا آپؐ ایک کپڑے سے سر باندھے ہوئے باہر نکلے پھر منبر پر بیٹھے۔ اللہ کی حمد وثنا بیان کی پھر فرمایا:

لوگوں میں سے کسی کا بھی مجھ پر جان اور مال کے لحاظ سے احسان ابوبکرؓ بن ابی قحافہ سے زیادہ نہیں ہے اور اگر میں کسی کو جانی دوست بنانے والا ہوتا تو ابوبکرؓ کو بناتا مگر اسلام کی دوستی ہی بہت اچھی ہے۔ دیکھو ابوبکرؓ کی کھڑکی کے سوا مسجد میں جتنی کھڑکیاں کھلتی ہیں سب بند کردو۔ (صحیح بخاری۔ کتاب الصلوۃ)

ان آیات میں سیدنا ابوبکر صدیقؓ کو ''اَلْاَ تْقٰی'' کا لقب ملا یعنی سب سے زیادہ پرہیز گار اور اسی کی وجہ سے وہ ''اَکْرَمُ عِنْدَاللہ'' ٹھہرے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللہ اَتْقٰکُمْ'' تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔''

ان کی مالی قربانیاں خالصتاً للہ اور فی للہ تھیں اس

بات کا اعلان بھی کر دیا گیا ''اِلَّا اِبۡتِغَاءِ وَجۡہِ
رَبِّہِ الۡاَعۡلٰی''' اور یہ قربانیاں اللہ کے ہاں مقبول
ومنظور ہوئیں اوع مزید نوازنے کی خوش خبری بھی۔
''وَلَسَوۡفَ یَرۡضٰی'' ' اور عنقریب نعمتیں
عطافرمائے کہ وہ خوش ہوجائے گا۔

آخری بات:رسول کریم ﷺ نے
فرمایا:''اصحابی کا لنجوم ایکم
اقتدیتم اھدیتم '' میرے صحابہ ستاروں کی
مانند ہیں جس کی بھی پیروی کروگے ھدایت پاؤ گے۔
سورۃ البقرۃ میں صحابہ کرام کے ایمان کو رول ماڈل کے
طور پر پیش کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:''اٰمِنُوۡ
اکَمَااٰمن الناس ''ایمان لاؤ جس طرح یہ لوگ
ایمان لائے۔''مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ اس آیت
میں''الناس'' سے مراد صحابہ کرام ہیں۔

☆☆☆

غصہ پی جانا، اہلِ جنّت کی صفت

غصہ کیا ہے

برداشت نہ کرنے کو، اخلاق کی پستی میں گرنے کو، ضبطِ نفس کھو دینے کو غصہ کہتے ہیں، کسی کی بے عزتی کرنے کو، اپنا وقار کھو دینے کو غصہ کہتے ہیں۔ غصہ انسانی تعلقات میں بگاڑ کا ایک بڑا سبب ہے۔

ہم غصہ کیوں کرتے ہیں

بعض اوقات تو بلاوجہ ہی غصہ آ جاتا ہے۔ لیکن اکثر ہم اپنی کوئی ذاتی Tention اپنا کوئی ذاتی برا تجربہ، اپنی خفت، اپنے ماتحت بندے پر نکال رہے ہوتے ہیں لیکن غصہ کرنے کی ایک بڑی وجہ منفی سوچ بھی ہوتی ہے جب ہم کسی کے بارے میں منفی سوچتے ہیں تو وہ بھی ہمیں برہم ہونے پر مجبور کر دیتا ہے۔ (منفی سوچنا)۔
بعض اوقات کسی کو نیچا دکھانے کے لیے، کسی پر رعب ڈالنے کے لیے، اپنے آپ کو برتر ثابت کرنے کے لیے اکثر حسد ہی ہمیں غصہ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

غصے کے اثرات

غصہ کی وجہ سے ہم کبھی کبھار انا پرست بھی ہو جاتے ہیں۔ اگر عاجزی کا رویہ غالب نہ آئے اور اپنی غلطی کا احساس نہ ہو تو ہم غصے کی اور اپنی انا کی وجہ سے تکبر اور غرور کا شکار بھی ہو سکتے ہیں۔ (جیسے ابلیس غصے کی وجہ سے ہی تکبر کا شکار ہوا)۔

غصے سے ہم اپنا وقار کھو بیٹھتے ہیں۔ لوگوں کی نظر میں شاید وقتی طور پر رعب قائم ہو جائے مگر مخاطب پر آپ کا پہلے والا تاثر برقرار نہ رہے گا اور دوبارہ اپنا مقام حاصل کرنے کے لیے آپ کو بہت زیادہ محنت کرنی پڑے گی کیونکہ دلوں کو محبت اور خلوص سے ہی جیتا جا سکتا ہے۔ دلوں کے حکمران بننے کے لیے عاجزی درکار ہے۔

غصے سے نہ صرف دوسروں پر برا اثر پڑتا ہے بلکہ غصہ اپنی ذہنی، جسمانی اور جذباتی صحت کے لیے بھی مضر ہے۔ غصے کی وجہ سے ہی انسان ذہنی تناؤ کا شکار ہوتا ہے۔ بلڈ پریشر جیسی بڑھتی ہوئی بیماری کی سب سے بڑی وجہ غصہ ہی ہے۔ اس کے علاوہ میگرین (آدھے سر کا درد) بھی اکثر غصے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

غصہ دل کے دورے اور دماغ کے دورے (برین ہیمرج) کی بھی ایک وجہ بن سکتا ہے۔اکثر ذہنی ونفسیاتی بیماریاں بھی غصے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

یہ تو کچھ دلائل ناقص عقل کے تھے اب غصے کو احکام ربانی اوراحادیث نبویؐ کی نظر سے دیکھتے ہیں بلکہ حقیقی رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ ایسی رہنمائی جو قرآن اورحدیث کے علاوہ کہیں مل بھی نہیں سکتی۔بس اس کے لیے **سمعنا و اطعنا** والا رویہ درکار ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وسارعو الی مغفرۃ من ربکم......(آل عمران۱۳۳-۱۳۴)

ترجمہ:''دوڑ کر چلواُس راہ پر جوتمھارے رب کی بخشش اوراس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اورآسمان جیسی ہے اوراُن خداترس لوگوں کے لیےمہیا کی گئی ہے جو ہرحال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں،خواہ بدحال ہوں یا خوش حال، جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔''

اس آیت کے مطابق غصہ پی جانا جنتیوں کی خوبی ہے۔ دوسری خوبی جو اسی کے ساتھ لازم ہے وہ یہ کہ غصہ پی جانے کے بعد معاف بھی کیا جائے کیونکہ جب تک ہم لوگوں کے قصور معاف نہیں کرتے اُس وقت تک کینہ بڑھتا جاتا ہے۔ یہی احسان ہے اوراحسان کرنے والوں سے اللہ محبت کرتا ہے اوراگر ہم رب کے پیارے بندے بننا چاہتے ہیں تو احسان کا رویہ اختیارکرنا چاہیے۔صرف غصہ پی جانے سےاوراندرہی اندر گھلنے کا فائدہ نہیں ہوگا جب تک پوری آیت پرعمل نہیں کریں گے لوگوں کو معاف کر دینے سے ذہنی اور روحانی، دونوں سکون ملتے ہیں۔قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

ترجمہ:''اوراللہ اوراُس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اورآپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمھارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اورتمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔'' (سورۃ الانفال۴۶)

معاف کرنے کا اجر

واقعہ افک میں حضرت ابوبکرصدیقؓ نے، بہتان لگانے والوں میں شامل ایک صحابی کوخرچ دینے کا ارادہ کرنا چاہا، اس پر اللہ نے اُن کی اصلاح کے لیے فوراً آیت نازل فرمادی۔

ترجمہ:''اورتم میں سے فضل والے اور وسعت

والے اس بات پر قسم نہ کھائیں کہ وہ رشتہ داروں، مسکینوں اور ہجرت کرنے والوں کو اللہ کی راہ میں نہیں دیں گے، اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھیں معاف کر دے؟ اور اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔'' (النور ۲۲)

منافق کی خصلت

غصہ جب حد سے بڑھ جائے تو بعض اوقات جھگڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے یہاں تک کہ جھگڑے میں گالم گلوچ بھی آ جاتی ہے جس کو آج کل سکول کالج کے بچے fun سمجھ کر Enjoy کرتے ہیں اور اپنی طاقت کا رعب ایک دوسرے پر ڈال کر فخر کرتے ہیں۔ منافق کی چار خصلتوں میں سے ایک یہ خصلت ہے کہ جب وہ جھگڑتا ہے تو گالم گلوچ پر اتر آتا ہے۔ (حدیث نبوی)

اردگرد موجود اشیا پر غصہ اتارنا

ہمارے ہاں یہ بھی رجحان بن گیا ہے کہ اردگرد پڑی چیزوں پر غصہ نکال کر انھیں توڑا یا پھینکا جاتا ہے اس کی زیادہ تر وجہ غصے کی شدید کیفیت ہی ہے جس میں انسان آپے سے باہر ہو جاتا ہے حالانکہ آپ کو یہ سن کر ہی بہت حیرانی ہوگی کہ یہ بھی منافق کی نشانی ہے۔

قرآن پاک میں احسن بن شریک نامی منافق کے بارے میں سورہ بقرہ میں یہ الفاظ نازل ہوئے۔

''اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے جس کی بات دنیاوی زندگی میں آپ کو بہت اچھی لگتی ہے اور جو اس کے دل میں ہے اس پر وہ اللہ کو گواہ بناتا ہے۔ حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے اور جب وہ پیٹھ پھیرتا ہے تو کوشش کرتا ہے زمین میں فساد کرے اور کھیتیاں اور نسل برباد کرے اور اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' (بقرہ ۲۰۵)

جیسے ہمارے ہاں آج کل غصے میں آ کر لوگ بچوں کو مارنا پیٹنا یا چیزوں کو توڑنا پھوڑنا شروع کر دیتے ہیں اور کوئی نہیں ملتا تو پالتو جانور کی شامت آ جاتی ہے۔

غصے کے تدارک کے لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ایک واقعہ کو، جو مشعل راہ بناتے ہیں۔ اللہ ہمیں ان تمام احکامات پر عمل کی توفیق عطا فرمائے اور حدیث کو سمجھنے کی توفیق دے کہ ''بہادری یہ نہیں ہے کہ تم کسی کو پچھاڑ دو، بلکہ بہادری یہ ہے کہ تم غصے میں اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔''

ایک بار نبی پاکؐ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ اکٹھے تھے کہ وہاں ایک بدو آ گیا اور ابوبکر صدیقؓ کو بہت برا

بھلا کہتا رہا اور یہاں تک کہ اُنھیں گالیاں دینی شروع کر دیں، حضرت ابوبکر صدیق خاموش رہے اور نبی پاکؐ مسکراتے رہے، لیکن جب اس نے حد کر دی تو حضرت ابوبکرؓ نے اس کی ایک دو باتوں کا جواب دے دیا۔ اس پر نبی پاکؐ غصہ ہوئے اور وہاں سے گھر چلے آئے، حضرت ابوبکر صدیقؓ بہت حیران ہوئے اور گھر آ کر آپؐ سے کہا جب وہ مجھے غلط بولتا رہا آپ مسکراتے رہے اور جب میں کچھ بولا تو آپؐ غصے سے واپس آ گئے۔ آپؐ نے جواب دیا کہ جب وہ بولتا رہا تو ایک فرشتہ تمھاری پشت پر کھڑا تمھاری طرف سے جواب دیتا رہا اور جب تم نے ناراضگی کا اظہار کیا تو شیطان آ گیا اور میں شیطان کے ساتھ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔''

اللہ ہمیں قرآن کی اس آیت کے مطابق بنا دے جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ مومن آپس میں انتہائی نرم دل اور (ایک دوسرے سے الفت اور محبت کے رشتے میں ڈوبے ہوئے جسم واحد کی طرح ہوتے ہیں) مگر کافروں کے لیے سخت دل (اور سخت ہتھیار جیسے) ہوتے ہیں۔

اللہ ہمیں غصہ کرنے اور سخت دل ہونے کی توفیق دے تو برما کے بدھ مت کافروں کے لیے صلیبی لشکروں کے لیے، ہم غصہ نکالیں تو عمر فاروقؓ جیسی ایمانی غیرت پر، ہمارا خون کھولے تو عملی طور پر غازی علم دین شہید جیسا کہ حرمت رسولؐ پر جان بھی قربان کر دیں۔

حضرت ابوایوبؓ بیان کرتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اپنے (مسلمان) بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑے رکھے کہ دونوں ملتے ہیں تو ایک اِس طرف منہ کر لیتا ہے اور دوسرا اُس طرف منہ کر لیتا ہے اور اِن دونوں میں سے بہتر وہ ہے جو پہلے سلام کرے۔ (اور اس طرح صلح میں پہل کرے)۔ صحیح بخاری۔

☆☆☆

میرے آغا جان

میری بہت ہی عزیز صائمہ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

ربِ رحمٰن سے آپ کے ایمان وصحت کی سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ!

اِس دفعہ بتول آغا جان کی یادوں سے معمور ہو کر اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ پڑھا۔ اللہ تعالیٰ تمھیں، ادارہ بتول اور تمام لکھنے والوں کو اجرِ عظیم عطا کرے اور آپ کی ان تحریروں کو قلم کی گواہیاں بنا کر میرے آغا جان کے حق میں قبول کرے اور اُن سے راضی ہو جائے۔

تمھیں میں کچھ چیزیں بھیج رہی ہوں جو بتول کے لیے خاص ہیں۔ پیاری صائمہ! خاص اس لیے بھی کہ آغا جان نے اپنی یادداشتوں کے حوالے سے ایک دفعہ مجھے کہا تھا کہ میری یادداشتیں صائمہ کو بھجوادو۔ مجھے اس کی تحریر بہت پسند ہے۔ بتول جب سے تمھارے پاس آیا تھا آغا جان اُسے بہت شوق سے پڑھا کرتے۔ مجھے اپنے شعور کی آنکھ کھولتے ہی اپنے گھر میں بتول کا شوق سے مطالعہ کرنا یاد ہے۔ آغا جان ہمارے گھر میں بچوں کے اور خواتین کے سارے ادبی رسالے منگوا کر رکھتے تھے اور ہم بڑا فخر کرتے تھے کہ اپنے خاندان اور ہمسایوں میں سب سے زیادہ کتابیں اور رسالے ہمارے گھر آتے ہیں۔ آغا جان نے ہم گھر والوں کو ذاتی خط بہت ہی کم لکھے ہیں۔ وہ خود ۲۴ شمیمہ ہم سے رابطے میں ہوتے تھے۔ اس لیے خط کی ضرورت ہی کبھی پیش نہ آئی مگر اب یاد کرتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ کچھ نہ کچھ لکھوا ہی لیتی۔ میرے پاس ایک خط اُن کا حرم شریف سے بھیجا ہوا محفوظ تھا جو میں نے سوچا کہ تمھیں ہی بھجوا دوں۔ تمھیں بڑا خیال رہتا ہے کہ بتول میں چیز Exclusive ہو اس لیے اسے تمھارے لیے بچا کر رکھا تھا۔ ایک آغا جان کا مضمون Creeping Islam ان کے کاغذات میں ملا جو کہ ان کی بہت خوبصورت یادوں پر مشتمل ہے۔ اسے ضرور چھاپ دینا۔ انھوں نے خود ہی اس کی پروف ریڈنگ بھی کی ہے اور جہاں نجم الدین اربکان

صاحب کا ذکر ہے اس کے ساتھ اپنے ہاتھ سے کچھ اضافہ بھی کیا ہے اسے متعلقہ جگہ پر کمپوز کروالینا۔

تاریخ جماعت کمیٹی نے امی کے انٹرویو کے لیے کہا تھا جو امی نے آغا جان کو بٹھا کر مجھے دیا تھا کہ مجھ سے کچھ بھول جائے تو میری تصحیح کردینا مگر امی تو تھوڑا بولیں، آغا جان نے مجھے امی کے بارے میں اتنی تفصیلات بتائیں کہ مجھے امی پر رشک آنے لگا کہ انھیں بہت ہی قدردان شوہر نصیب ہوا ہے۔ خیر بقول مسز ڈاکٹر منصور علی آپا جان تو قاضی صاحب کی ایک پجارن کی طرح خدمت کرتی تھیں۔ مجھے اپنے آغا جان حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عاشق امتی لگتے تھے جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول اور ہر فعل کے اتباع کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے ہوئے تھے۔ چاہے وہ اللہ کی زمین پر اللہ کا نظام غالب کرنے کی جدوجہد ہو یا گھر میں اہل خانہ کے ساتھ تعلقات ہوں وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے پیروکار تھے۔ ہماری امی کو اتنا زیادہ بااختیار بنایا ہوا تھا کہ گھر میں آخری فیصلہ امی کا ہی مانا جاتا تھا۔ امی بھی آغا جان کی حد سے زیادہ اطاعت کرتی تھیں وہ فالصالحات قانتات کی عملی تفسیر تھیں مگر آغا جان بھی ہر معاملے میں ان کی مرضی پر ہی فیصلے کرتے تھے۔ آغا جان کی ساری آمدنی امی کے ہاتھوں میں ہوتی تھی وہ بہت سلیقے سے خرچ کرتی تھیں مگر میرے آغا جان نے زندگی میں کبھی پلٹ کر نہیں پوچھا کہ تم نے اتنے پیسے کیا کیے۔ ہمیشہ آغا جان امی کے سگھڑاپے کی تعریف کیا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ مسکرا کر کہتے کہ تمھاری امی بہت بڑی Women rights activist ہیں۔

ہمیں بہت زیادہ اعتماد دیا۔ ہم دونوں بہنوں کو بھائیوں سے زیادہ محبت اور شفقت ملی۔ صحیح معنوں میں وہ عورتوں کے حقوق کے علمبردار تھے۔ میرے شوہر ڈاکٹر جمیل کی وفات کے بعد مجھے آغا جان نے اپنی جائیداد اور کاروبار کا حصہ دے دیا اور جو حصہ مجھے ابھی ان کی وفات کے بعد ملنا تھا وہ ۱۴ سال پہلے مجھے اس کا مالک بنا گئے تھے۔ میرے ہاتھوں سے وہ سارا حساب کتاب لکھواتے تھے۔ منصورہ میں ہمیں پشاور سے اپنے کاروبار کی آمدنی وصول ہوتی تھی جسے وہ میرے ذریعے سے تقسیم کرواتے تھے اور میرا بیٹا محمد جب بڑا ہوا تو اس کے اکاؤنٹ میں منگواتے تھے اور وہ ہمیں پہنچا دیتا۔

میرا مقصد یہ بتانا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات پر وہ دل و جان سے عمل پیرا تھے، سب کے حقوق ادا کرنے والے، منصورہ کے ملازم اور منصورہ میں گھروں میں کام کرنے والی ماسیاں اتنا بلک بلک کر روتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ہم سب یتیم ہو گئے ہیں۔ باہر وہ قاضی حسین احمد تھے اور گھر میں ہمارے انتہائی محبت کرنے والے عام سے شفیق آغا جان۔ ان کی زندگی میں محبت، محنت اور اخلاص سے بھرپور جدوجہد کے الفاظ کو بڑا اہم مقام حاصل تھا۔

وہ مجھے ''یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم'' کی عملی تصویر نظر آتے تھے۔ رہام کہتی ہے:

''ان کی مغفرت کے لیے تو میں ہی کافی ہوں۔ مجھے آغا جان کی موجودگی میں کبھی احساس ہی نہ ہوا کہ میرے ابو نہیں ہیں۔ انھوں نے اتنی بھرپور شفقت اور محبت دی اور سب سے بڑھ کر عزت دی۔ ہم پر انھوں نے ترس کھا کر خرچ نہ کیا بلکہ ہمیں بہت اعتماد دیا۔'' وہ روتے روتے کہتی ہے کہ ''آغا جان میرے لیے بہت زیادہ ٹائم نکالتے تھے۔ آپ تو بہت مصروف لوگ ہو۔ وہ میرے لیے دنیا کے سب سے زیادہ فارغ آغا جان تھے جو گھنٹوں میری بات سنا کرتے تھے۔ وہ مجھے اپنے شفیق سینے پر جب سلا لیتے تو مجھے دنیا کی کوئی فکر ہی نہ رہتی۔ ایسا استقبال کرتے کہ ان کا روشن چہرہ اور خوبصورت ہو جاتا اور میرے دل تک ان کی مسکراہٹ کی ٹھنڈک پہنچ جاتی کہ وہ مجھ سے مل کر کتنا خوش ہوئے ہیں۔''

میرے بیٹے محمد کو امی اور آغا جان نے اپنا تیسرا بیٹا بنا کر پالا ہے۔ اس کی تعلیم، اس کی ملازمت، اس کی شادی کی کسی بھی چیز کی مجھے کوئی خبر نہ ہونے دی۔ مجھے انھوں نے ساری ذمہ داریوں سے فارغ کر کے جماعت کے کاموں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ محمد کی شادی سے پہلے کی بات ہے۔ ایک دفعہ اُنھیں میں کچھ پریشان سی نظر آئی تو مجھے بلا کر کہا کہ کیوں پریشان ہو؟ میں نے کہا کہ کوئی خاص بات نہیں مگر شادی کے انتظامات کی فکر ہے۔ مجھے کہا کہ بیٹا ادھر آؤ۔ اپنے شفیق سینے پر میرا سر رکھا اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا کہ ایک بات بتاؤں؟ میں نے کہا کہیے۔ کہا بیٹا کسی بھی شوہر کو اپنی بیوی سے اتنی محبت نہیں ہوتی جتنی ایک باپ کو اپنی بیٹی سے ہوتی ہے تو مجھے علم ہے کہ جمیل نہیں ہیں مگر جب تک

میں ہوں تمھیں کسی چیز کی کوئی فکر نہیں ہونی چاہیے۔ یہ سن کر میرے دل کا سارا بوجھ ایسے ختم ہوگیا کہ جیسے کوئی فکر نہیں ہے۔ مجھے اپنے رب کے ساتھ بہت جوڑ کر رکھتے تھے۔ ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کرنے کا کہتے۔ اللہ نے اُنھیں بہت مالی آسودگی عطا کر رکھی تھی اور اُنھوں نے اسے دونوں ہاتھوں سے اللہ کے دین پر اور ہم پر فراخ دلی سے خرچ کیا اور اللہ نے اُنھیں بہت برکت عطا کی۔

وہ ہم چاروں سے الحمدللہ بہت مطمئن تھے۔ انھوں نے شعوری طور پر ہماری تربیت کی۔ ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں تحریک سے جوڑا۔ میں اور لقمان بڑے تھے۔ ہم سے بھی بڑی محبت کی مگر خولہ اور انس چھوٹے تھے تو وہ دونوں انتہائی لاڈلے تھے۔ ان دونوں کی اولاد بھی اتنی ہی لاڈلی تھی۔ ہمارے بچے ذرا بڑے تھے کہتے تھے کہ بڑوں کا اپنا مزہ ہے اور چھوٹوں کا الگ لطف ہے۔

یادیں تو ختم ہی نہیں ہو رہیں مگر ان شاء اللہ آئندہ بھی کوشش کروں گی کہ آغا جان کی یادیں آپ کے ساتھ تازہ کرسکوں۔ انھیں بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں کہ اللہ اُن سے راضی ہو جائے۔ ان کے آگے کی ساری منزلیں آسان ہوں۔ ان کی قبر جنت کا باغیچہ بن جائے اور اللہ ان کا آسان حساب لے۔ ان کو عافیت اور اپنی رحمت میں رکھے۔ ایک حدیث قدسی ہے کہ اللہ فرماتا ہے کہ میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق اُس سے سلوک کروں گا۔ میرے رحمٰن رب! میرے آغا جان کا تجھ سے گمان تھا کہ تو ہم سب کو جنت میں اپنی رضا کے سائے میں ملائے گا۔ تو ہمیں اُن کا صدقۂ جاریہ بنا کر اُن سے جنت میں ملانا اور ان کی برکات سے ہمیں محروم نہ کرنا۔

سب بہنوں سے دعاؤں کی درخواست۔

تمھاری

راحیل

☆☆☆

”بیٹی کے نام ایک مکتوب“

پیاری بیٹی راحیل!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

یہ خط مسجد حرام میں حالت اعتکاف میں بیٹھ کر آپ کو لکھ رہا ہوں۔ کل سے یہاں معتکف ہوں۔ اعتکاف سے پہلے ٹیلی فون پر آپ کی امی سے بات ہوئی تھی انھیں آپ کا خط مل گیا تھا شاید وہی خط انھوں نے نواز خان

صاحب کے پتے پر مجھے بھیج دیا ہو۔ بہر حال مجھے اندازہ ہے کہ آپ نے خط میں کیا لکھا ہوگا۔

اس وقت میں باب عبدالعزیز کے اوپر پہلی چھت میں کعبے کی طرف رخ کر کے بیٹھا ہوا ہوں۔ ابھی ابھی تلاوت قرآن کریم سے فارغ ہوا ہوں۔ تلاوت سے پہلے ایک طواف کر کے آیا ہوں۔ ظہر کی اذان ہونے والی ہے لیکن موسم اچھا ہے زیادہ گرمی نہیں ہے۔ طواف کے وقت بھی آپ کے لیے خصوصی دعائیں مانگی ہیں او ریہاں بیٹھ کر بھی تلاوت کے دوران آپ محمد اور جمیل الرحمٰن ذہن میں گھوم رہے تھے۔ آپ نے جمیل الرحمٰن کی صحت کے لیے خصوصی دعا مانگنے کے لیے کہا تھا اس لیے وہ زیادہ یاد رہتے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ آپ لوگوں کے لیے میری دعا کیا ہے یہ کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دین کی سربلندی کے لیے عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آپ کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی رضا کے راستے کھول دے آپ امت مسلمہ کے لیے خیر اور تقویت کا باعث بنیں کہ یہی دنیا و آخرت میں کامیابی ہے۔

یہاں کے صبح و شام تلاوت و سماعت قرآن میں گزرتے ہیں۔ نماز عشاء و تراویح میں تقریباً دو شیمہ گزر جاتے ہیں۔ اس کے بعد نصف شیمہ تک ملاقاتیں ہو جاتی ہیں۔ ایک آدھ گھنٹہ آرام کے بعد پھر قیام اللیل (نماز تہجد) شروع ہو جاتی ہے اور تقریباً ڈیڑھ دو شیمہ اس میں گزر جاتے ہیں۔ اس کے بعد تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ آرام کے لیے ملتا ہے۔ پھر سحری اور فجر کے بعد کچھ دیر تلاوت کرنے کے بعد سب لوگ سو جاتے ہیں اور تقریباً دس بجے تک سوتے رہتے ہیں۔

جمیل الرحمٰن کی والدہ صاحبہ اوران کے بھائیوں اور بہنوں کو میرا سلام اور میری دعائیں پہنچا دیں۔ جماعت سے متعلق سب خواتین کو بھی میری طرف سے سلام اور دعائیں پہنچا دیں۔ جمیل الرحمٰن کے ذریعے جماعت کے سب رفقاء مولانا عبدالحق بلوچ صاحب، عبدالحمید مینگل صاحب، عبدالمجید خان صاحب اور مولانا عبدالغفور بلوچ صاحب اور دوسرے رفقاء کو سلام عرض کر دیں۔

والسلام

حسین احمد

۶/اپریل ۱۹۸۹ء

☆☆☆

پھیلتا ہوا اسلام

آغا جان کے کاغذات سے ملنے والی ایک تحریر جو گزشتہ سال لکھی گئی۔ سمیحہ راحیل

آج سے ۳۱ سال قبل ۱۹۸۰ء میں غرناطہ کے سیاحت کے ایک دفتر میں مسلمانوں کے کسی مرکز کا پتہ دریافت کرنے کے لیے گیا۔ ایک بڑے بوسیدہ سے رجسٹر کو الٹ پلٹ کرنے کے بعد کاؤنٹر پر کھڑے شخص نے مجھے ایک ایڈریس لکھوایا۔ یہ پتہ میں نے ایک ٹیکسی والے کو دکھایا اور وہ مجھے بہت سی پیچ در پیچ گلیوں سے گزار کر ایک گلی میں واقع ایک پرانے مکان پر لے گیا میں نے ٹیکسی والے سے کچھ دیر انتظار کرنے کے لیے کہا تاکہ میں معلوم کر سکوں کہ کیا اس نے مجھے ٹھیک جگہ پر پہنچایا ہے۔ مکان کے اندر داخل ہوا تو ایک بڑے تھال کے گرد دنیا کے مختلف ممالک کے تقریباً پندرہ فراد روایتی اسلامی لباس جبے اور قبے پہنے ہوئے کھانے کے لیے بیٹھے تھے اور مجھے تعارف سے پہلے ہی کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دے رہے تھے۔ میں نے گھر سے باہر نکل کر ٹیکسی ڈرائیور کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے رخصت کیا اور دوبارہ اندر داخل ہو کر کھانے کے تھال کے گرد حلقہ باندھے ہوئے مجمع میں شامل ہو گیا۔ اس مجمع میں برطانیہ کے انگریز، مراکش کے عرب اور خود غرناطہ کے نومسلم شامل تھے۔ مجھے حیرت ہوئی جب تعارف کے بعد ایک شریک محفل نے میرے ساتھ پشتو میں بات شروع کی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب پاکستان میں مکمل امن تھا اور ساری دنیا کے سیاحوں کے لیے سوات، پشاور اور افغانستان ایک جنت بنا ہوا تھا۔ ان کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل تھی جن کو عرف عام میں ہپی (Hippy) کہتے تھے۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد غرناطہ کے ایک نومسلم ساتھی نے مجھے غرناطہ کی سیر کی دعوت دی اور کہا کہ غرناطہ کے گلی کوچوں میں پیدل چل کر مجھے زیادہ خوشی ہو گی۔ انھوں نے مجھے غرناطہ کی ایک خصوصیت یہ بتائی کہ سارے مکانات پر باہر سے سفیدی کرائی گئی ہے۔ یہ اسلامی دور کی یادگار ہے۔ دوسری خصوصیت اس نے یہ بتائی کہ کھڑکیوں کی

اونچائی قد آدم سے اوپر ہے یہ بھی مکانات میں روایتی پردے کے اہتمام کی باقی ماندہ علامتوں میں سے ہے۔ ہم غرناطہ کی گلی کوچوں سے ہوتے ہوئے کھلی شاہراہ پر پہنچے۔ یہاں کئی جگہ میرے ساتھی نے راستے میں کچھ لوگوں سے دعا سلام کی اور مجھے یوں لگا کہ جیسے میں مسلم اندلس میں گھوم رہا ہوں جہاں مسلمان اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ میرے ساتھی نے مجھے بتایا کہ غرناطہ میں مقامی اندلسی نومسلموں کی تعداد کل تین سو ہے لیکن رات کے وقت جب ہم سڑکوں پر گھومتے ہوئے آپس میں ملتے ہیں اور دعا سلام کرتے ہیں تو اجنبیوں کو یوں لگتا ہے جیسے پورا شہر مسلم آبادی سے بھرا ہوا ہے۔

آپس میں گفتگو کرتے ہوئے ہم کھانا کھانے کے لیے ایک ریستوران میں بیٹھ گئے۔ اندلسیوں کی سرزمین پر غرناطہ میں ایک مسلمان نوجوان کی رفاقت میں مسرت کے جذبات سے میرا دل ابل رہا تھا۔ میرا ساتھی مجھے بتا رہا تھا کہ اسلام پتھر کی طرح جامد وجود نہیں ہے بلکہ یہ ایک ہرے بھرے درخت کی طرح زندہ وجود ہے اگر اسے نچلے تنے سے بھی کاٹا جائے تو اس کی جڑوں سے نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ اندلسی نوجوان کو یقین تھا کہ اندلس کی سرزمین پر اسلام کے جس تناور درخت کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کی گئی تھی وہ کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ اس درخت کی جڑیں اندلس کی سرزمین میں عمیق گہرائی تک پھیلی ہوئی ہیں اس میں سے نئی شاخیں پھوٹیں گی اور برگ و بار لائیں گی۔ اندلسی نوجوان کا یقین اتنا راسخ تھا کہ مجھے اقبال کا یہ شعر یاد آنے لگا۔

دانۂ، را کہ در آغوش زمین است ہنوز
شاخ در شاخ و برومند و جوان می بینم

اس دانے کو جو ابھی زمین کی آغوش میں چھپا ہوا ہے۔

شاخ در شاخ اور ثمر بار اور جوان دیکھ رہا ہوں۔

یہی حال ۱۹۷۰ء کے عشرے میں وسط ایشیا کا تھا۔ ہمارے افغان دوست سمگلروں کے ذریعے کچھ اسلامی کتابیں تاجکستان میں بھیجا کرتے تھے۔ ہمیں یقین تھا کہ تاجکستان، ازبکستان، ترکمانستان، کرغیزستان، قازقستان، آذربائیجان اور کوہ قاف کے علاقے جن میں چیچنیا اور داغستان شامل ہیں اور روس فیڈریشن میں شامل تاتارستان ایک بار پھر

اسلامی دنیا کا حصہ بنیں گے۔ لیکن روس کے حلقہ بگوش حلقے جن میں پاکستانی کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کے علاوہ صوبہ خیبر پختونخوا اور بلوچستان کے نام نہاد وقوم پرست بھی شامل تھے ہمارے اس یقین کو زعم باطل سمجھتے تھے اور ہمارا مذاق اڑاتے تھے اور کہتے تھے کہ ان علاقوں کو بھول جاؤ وہاں اب مسلمان نہیں بلکہ سوویٹ انسان بستے ہیں جنھوں نے مذہب کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ تاریخ کا پہیہ پیچھے کی طرف کبھی نہیں گھومے گا یہ اب آگے کی طرف ہی گھومے گا اور سوویٹ تحریک وسط ایشیا سے افغانستان کے راستے پاکستان کا رخ کرے گی۔ لیکن اسلام نے وسط ایشیا کے تمدن پر اتنے گہرے اثرات چھوڑے ہیں کہ ستر سال تک جبر کے تمام ہتھکنڈوں کے باوجود سوویٹ یونین کے ٹوٹتے ہی اسلامی تہذیب ان علاقوں میں نمودار ہونے لگی اور استعماری طاقتوں کو تشویش لاحق ہوگئی کہ مشرقی یورپ سے مشرقی ترکستان تک پھیلا ہوا ترک مسلمانوں کا وسیع وعریض خطہ اگر پھر اسلامی دنیا کے ساتھ ہم آغوش ہوگیا تو اس نئی سپر طاقت کا مقابلہ کیونکر ممکن ہوگا۔

اگر چہ اس وقت ظاہر بین نظروں کو یہ دیوانے کی بڑ معلوم ہوتی ہے لیکن آج سے تیس سال قبل سوویٹ یونین کی پسپائی بھی اسی طرح ناممکن نظر آ رہی تھی۔ ایک صاحب ایمان کا وجدان جو ممکنات دیکھ سکتا ہے وہ ایک منافق اور کافر کی نظر سے اوجھل ہوتی ہیں۔ اقبالؒ کو یہ انقلاب ستر سال پہلے نظر آ رہا تھا جب انھوں نے کہا تھا۔

انقلابے کہ نہ گنجد درضمیر افلاک
بینم و ہیچ نہ دانم کہ چساں می بینم

وہ انقلاب کہ آسمانوں کے ضمیر میں نہیں سما سکتا، دیکھ رہا ہوں اور کچھ نہیں پتہ کہ کیسے دیکھ رہا ہوں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ساٹھ سال پہلے جماعت اسلامی کی بنیاد رکھتے ہوئے یہی خواب دیکھا تھا کہ ان شاء اللہ اسلام کی احیاء کے بعد سرمایہ دارانہ نظام کو واشنگٹن اور کمیونزم کو ماسکو میں پناہ نہیں ملے گی۔

آج سے تقریباً نوے سال قبل جب دنیا کی استعماری طاقتیں یورپ کے مرد بیمار عثمانی امپائر کی آخری رسومات ادا کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے اور عثمانی خلافت کا خاتمہ کر کے وہ سمجھنے لگے کہ انھوں نے مصطفیٰ کمال کے ذریعے اسلام کو شکست دے کر

اسلامی حکومت کی بجائے سیکولرزم کو ترکی کے دستور کی بنیاد بنا دیا ہے تو علامہ اقبال نے مصطفیٰ کمال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

لادینی ولاطینی کس پیچ میں الجھا تو
دارو ہے ضعیفوں کا لا غالب الا ہو

مصطفیٰ کمال نے یہ سمجھا تھا کہ بڑی تعداد میں علماء کو قتل کر کے اور عربی رسم الخط کو لاطینی رسم الخط میں تبدیل کر کے اور اسلام کی بجائے سیکولرزم اور لادینیت کو ملکی دستور کی بنیاد قرار دے کر وہ ترک قوم کا رشتہ اپنے شاندار ماضی سے کاٹنے میں کامیاب ہو جائے گا اور اسے یورپ کا ایک ملک بنا دے گا جس میں یورپین تہذیب کو فروغ ملے گا لیکن ترکی قوم کے ضمیر میں گندھے ہوئے اسلامی اقدار تک اس کی نظر نہ پہنچ سکی۔ ترکی میں اسلامی قوتوں نے جبر و استبداد کے ہتھکنڈوں کے مقابلہ کرنے کے لیے نئی حکمت عملی بنائی۔

علامہ بدیع الزمان نورسی کی نوری تحریک ان میں پیش پیش تھی۔ نورسی رسائل کے ذریعے انھوں نے اپنا پیغام خاموشی سے پھیلانا شروع کیا۔ اسلام کے ساتھ محبت رکھنے والے اتراک اس کے حلقہ بگوش ہو گئے اور سینہ بہ سینہ ان کے پیغام کو پھیلاتے رہے ان کے پیش نظر کوئی فوری تبدیلی یا انقلاب نہیں تھا بلکہ وہ اسلامی تہذیب اور اسلامی فکر کو بچانے کا ایک پچاس سالہ منصوبہ لے کر خاموشی سے اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگے۔

آج کے ترکی کے طول وعرض میں بدیع الزمان نورسی کے لائق خلیفہ محمد فتح اللہ گولن ان کی تحریک کی آبیاری کر رہے ہیں۔ ساری دنیا میں ان کے تعلیمی ادارے قائم ہیں ان کی تحریک کے زیر اہتمام ٹیلی ویژن چینل اور بے شمار ایف ایم ریڈیو چل رہے ہیں۔

آج سے پندرہ سال قبل میں ان سے ملنے کے لیے استنبول میں واقع ان کے مرکز میں گیا۔ انھوں نے شکایت کی کہ ترکی میں سب سے پہلا رابطہ ہماری تحریک کا ان کی تحریک سے ہوا تھا لیکن بعد میں یہ رابطہ کمزور پڑ گیا اور اصرار کیا کہ میں رات بسر کرنے کے لیے ان کے مہمان خانے میں ٹھہروں۔ صبح ناشتے پر وہ میرے ساتھ بے تکلفی سے زمین پر بیٹھ گئے۔ ناشتے کی مجلس میں شرکت کے لیے انھوں نے خصوصی طور پر اپنے حلقے کے ایک اہم فرد کو بلایا تھا جنھوں نے

اقبال کے کلام کے کئی حصوں کا ترکی میں ترجمہ کیا ہے۔

خواجہ محمد فتح اللہ گولن نے اپنی تحریک کو خاموش اور نظروں سے اوجھل رکھنے کے لیے خود بھی داڑھی نہیں رکھی اور اپنے مریدوں کو داڑھی نہ رکھنے کی اجازت دی ہے ترکی میں ان دنوں فوج میں پکے نمازیوں اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کی ترقی پر پابندی تھی۔ کئی مسلمان افسر محض اس وجہ سے سبکدوش کر دیے گئے تھے کہ انھوں نے اپنے بیٹوں یا بیٹیوں کو قرآن کریم حفظ کرایا ہے۔ اپنے مریدوں کو سخت گیر فوجی سربراہوں کی سختی سے بچانے کے لیے انھوں نے اجازت دے رکھی تھی کہ وہ اشارے سے نماز پڑھ سکتے ہیں تاکہ ان کے ٹخنوں اور پیشانیوں پر نماز پڑھنے کے نشانات نہ پڑیں۔

ان کی اس احتیاط کا نوٹس لیتے ہوئے میں نے ان کے اقبالیات کے ماہر مرید سے کہا کہ اقبال تو کہتا ہے کہ ؎

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی ازل سے رہا ہے قلندروں کا طریق

اس کا جواب دیتے ہوئے خود خواجہ محمد فتح اللہ گولن نے کہا کہ اصحاب کہف جب مسکوں سال کے طویل نیند سے جاگنے کے بعد اپنے ایک ساتھی کو سکہ دے کر خوراک لانے کے لیے بازار بھیجنے لگے تو اسے ہدایت کی کہ 'والیتلطف ولا یشعرن بکم احدا' بہت احتیاط کرے تاکہ تمھارے بارے میں کسی کو خبر نہ ہو۔

اگرچہ ہمارے علماء اس دلیل کو قبول نہیں کریں گے اور نہ احتیاط میں اس جدت کو قبول کریں گے لیکن بدیع الزمان نورسی اور خواجہ محمد فتح اللہ گولن نے ان طریقوں سے ترکی میں اسلام کو زندہ رکھا۔ عدنان میندریس نے عربی اذان کو بحال کر کے اور حج پر سے پابندی اٹھا کر ترک قوم کو واپس اسلامی دنیا سے ملانے کے جو انقلابی قدم اٹھائے اور جن اقدامات کو ترک عوام کی طرف سے پرجوش پذیرائی ملی اس کی پشت پر صوفیاء کی یہی خاموش تحریکیں کارفرما تھیں۔

عدنان میندریس کے بعد ترگت اوزال نے خواجہ محمد فتح اللہ گولن کی کھل کر حوصلہ افزائی کی۔ اگرچہ خواجہ محمد فتح اللہ گولن نے کبھی سیاست میں کھل کر حصہ نہیں لیا لیکن ان کی تحریک کے زیر اثر ترکی میں اسلامی رجحانات رکھنے والے سیاستدانوں کو فائدہ

پہنچا۔

حالیہ انتخابات میں ۴۵ سال بعد پہلی مرتبہ طیب رجب اردگان کے زیر قیادت AK پارٹی کو پچاس فیصد سے زیادہ ووٹ ملے ہیں۔ ۴۵ سال قبل عدنان میندریس کو پچاس فیصد سے زیادہ ووٹ ملے تھے جس کی وجہ سے انھوں نے ایوان میں دو تہائی اکثریت حاصل کر لی تھی۔

میندریس کو عربی اذان اور حج پر سے پابندی ہٹانے کے جرم کی وجہ سے جمال گرسل کی زیر قیادت فوجی مارشل لاء نے سزائے موت دی۔ لیکن بعد میں سویلین حکومت نے عدنان میندریس کو پس از مرگ تمام الزامات سے بری قرار دے کر پورے قومی اعزاز کے ساتھ استنبول کی ایک بڑی شاہراہ پر واقع ترگت اوزال کے مقبرے کے قریب دفن کیا۔

جمال گرسل کے مارشل لاء نے متناسب طریق نمائندگی نافذ کی اور اس میں یہ شرط عائد کی کہ دس فیصد سے کم ووٹ لینے والی پارٹی کو پارلیمنٹ میں نمائندگی کا حق نہیں ہوگا۔ اس طرح ایک طرف تو بڑی پہاڑی کو دوتہائی اکثریت حاصل کرنے سے محروم کر دیا کیونکہ سنگل ممبر حلقے کے انتخابات میں امیدواروں کی زیادہ تعداد کی وجہ سے پینتیس چالیس فیصد ووٹ حاصل کرنے والی پارٹی کو دوتہائی اکثریت مل جاتی ہے۔ دوسری طرف نئے انتخابی نظام کے تحت ملی سلامت پارٹی کا پارلیمنٹ میں داخلہ روک دیا۔ حالیہ انتخابات میں طیب رجب اردگان کی AK پارٹی کو اگرچہ دوتہائی اکثریت نہ مل سکی لیکن پچاس فیصد سے زیادہ ووٹ حاصل کر کے وہ اس دعویٰ میں حق بجانب ہیں کہ ترک عوام کی اکثریت ان کے ساتھ ہے۔

اقتصادی میدان میں اپنی نمایاں کارکردگی کی بنیاد پر طیب رجب اردگان ترکی کے ایک ہر دلعزیز لیڈر ہیں۔ ترکی کے سیاسی افق پر طیب رجب اردگان کے روشن ستارے کا نمودار ہونا پروفیسر نجم الدین اربکان کی قیادت کا مرہون منت ہے۔ جن کی اپنی سعادت پارٹی کو حالیہ انتخابات میں ۱.۵ فیصد یعنی صرف پانچ لاکھ ووٹ ملے ہیں۔

پروفیسر نجم الدین اربکان نے ۱۹۶۰ء کے عشرے میں فیصلہ کیا کہ ترکی کے سیکولر دستور کے باوجود ترکی کے ملی روایات کے حوالے سے ترکی کی سیاست میں اسلام کے نام کا احیاء کیا جائے۔ وہ پہلے

قونیہ سے آزاد رکن پارلیمنٹ کے طور پر منتخب ہوئے بعد میں ملی نظام پارٹی کی بنیاد رکھی۔ سیکولر فوجی قیادت نے بار بار کی مداخلت کرکے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن وہ پینترے بدل بدل کر بار بار نمودار ہوتے رہے۔ ان کی پارٹی کی کوکھ سے رجب طیب اردگان کی AK پارٹی یا ''سفید پارٹی'' نے جنم لیا ہے۔ AK پارٹی کو بھی اپنے تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود مغربی ممالک شک کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ یورپین کمیونٹی میں ترکی کے داخلے کے راستے میں اسی لیے رکاوٹیں ڈالی جا رہی ہیں کہ AK پارٹی کے زیر اہتمام ترکی میں اسلام کا احیاء ہو رہا ہے۔

دوسری بڑی پارٹی پیپلز پارٹی ہے جو روایتی لادینیت کے باوجود کچھ اسلامی سلوگن لے کر آئی ہے جن میں حجاب پر پابندی ختم کرنے کا وعدہ بھی شامل ہے اس پارٹی کو ۲۶ فیصد ووٹ ملے ہیں اور دونوں بڑی پارٹیاں مل کر ترکی کے فوجی آئین کو تبدیل کرکے ایک سویلین آئین لا سکتے ہیں اگرچہ فی الحال اس کا امکان نہیں ہے کہ ترکی سیکولرزم کی بجائے اسلام کو اپنے آئین کی بنیاد بنا دے لیکن اسلام کی جو لہریں خاموشی کے ساتھ چل رہی ہیں جن کو مغربی دنیا میں Creeping Islam (رینگتا ہوا اسلام) قرار دیا جا رہا ہے۔ اس کے پیش نظر وہ دن زیادہ دور نہیں ہے جب اسلامی خلافت کا یہ مرکز پھر سے اسلامی دنیا کی قیادت کے لیے میدان میں نکلے گا۔

پاکستان جو اسلامی نظریے کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے جس کا وجود ہی اسلامی نظریۂ حیات کا مرہون منت ہے جو اسلامی دنیا کا واحد نیوکلیر ملک ہے جس کے عوام قرآن پاک کی بے حرمتی اور رسول پاکؐ کی توہین پر دیوانہ وار گھروں سے باہر نکل آتے ہیں۔ کیا دنیا بھر میں پھیلنے والی اس تحریک کے اثرات سے محروم رہے گا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا لیکن یہاں ایک صاحب ایمان، حکمت والی قیادت اور ایک ایسی تنظیم کی ضرورت ہے جو ان کروڑوں عوام کے لیے اپنے آغوش وا کر دے جو اسلام اور اسلامی تہذیب سے محبت کرتے ہیں۔

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
آ ملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک
بزم گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغام سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

☆☆☆

غزل

در تو در ، سایۂ دیوار سے ڈر لگتا ہے
اپنا ہوتے ہوئے غیروں کا نگر لگتا ہے

دن نکلتے ہی امڈ آتے ہیں کالے سائے
کسی آسیب کا اس گھر پہ اثر لگتا ہے

خون آلودہ سبھی ہاتھ ہیں دستانوں میں
اب کے اندیشہ بہ اندازِ دگر لگتا ہے

اوڑھنے روز نکلتی ہے رِدا زخموں کی
زندگی تیرا تو پتھر کا جگر لگتا ہے

کب سے امید کا کشکول لیے بیٹھے ہیں
آسرا کوئی اِدھر ہے نہ اُدھر لگتا ہے

جانے کب بحرِالم کس کو کہاں لے ڈوبے
اب تو ہنستے ہوئے یہ سوچ کے ڈر لگتا ہے

کھیلوں پہنائیِ صحرا سے بگولے کی طرح
وسعتِ دشت میں کھو جاؤں تو گھر لگتا ہے

نجمہ یاسمین یوسف

اس کا شکر

جس نے تخلیق کیے تیرےؐ لیے دونوں جہاں
قلبِ اطہر پہ ترے جس نے اتارا قرآں

اپنے بندوں کی تجھے جس نے امامت بخشی
اور بدلے میں تجھے خُلد کی کنجی دے دی

جس نے افلاک پہ مہمان بنایا تجھ کو
جس نے دنیا میں ترے نام کو عزت بخشی

جس نے مشکل میں تجھے صبر کی قوت بخشی
جس نے ہر گام تجھے اپنی ہدایت بخشی

جس نے لہجے میں ترے خاص حلاوت رکھی
معاف کردینے کی جس نے تجھے عادت بخشی

اس کا احسان ہے ہم کو تیریؐ امت میں رکھا
شکر ہے اس نے ہمیں حلقۂ رحمت میں رکھا!

شمیم فاطمہ

غزلیہ

پھر وہی دھرنا اور لاشیں
پھر وہی آنسو اور آہیں

وہی تغافل اپنوں کا
وہی زمانے کی گھاتیں

برس رہی ہیں شہروں پر
رنج و غم کی برساتیں

صبح کا چہرہ خوف زدہ
سہمی سہمی سی شامیں

شور ہے اک آوازوں کا
بس ہیں باتیں ہی باتیں

(19فروری کی اداس دوپہر)

شمیم فاطمہ

غزل

کڑکتی دھوپ میں مزدور اپنا خوں بہاتا ہے
کلیجہ منہ کو لے آتا ہے تب پیسے کماتا ہے

نہ جانے گھر میں کتنوں کو بلکتا چھوڑ آتا ہے
محبت دوستی کے سارے بندھن توڑ آتا ہے

تڑپنا اور نہ کچھ افسوس کرنا کام آتا ہے
جو کچھ تقدیر میں لکھا ہے کون اس کو مٹاتا ہے

محبت کیا کرو گے عاشق کس سے جتاؤ گے
یہاں تو نام لینے سے ہی ''دیرہ'' یاد آتا ہے

حقیقت ایک جیسی تلخ ہوتی ہے زمانے میں
کوئی بھی دور ہو حق بولتا سولی چڑھاتا ہے

(دیرہ: ریاض میں سزائے موت اسی پر دی جاتی ہے)

شہود ہاشمی۔ ریاض

رپورٹ

''سر!''شبیر کی آواز پر میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ ایک عجیب میلے سے حلیے مکیں میں ایک آدمی کو لیے کھڑا تھا۔

''کیا بات ہے......؟ یہ کون ہے؟''میں نے پوچھا۔

ساتھ ہی میں نے اس آدمی کو غور سے دیکھا۔ میرا خیال ہے پینتیس چالیس کے درمیان عمر ہوگی۔ چہرے پر عجیب سی بے نیازی تھی ، کپڑے میلے اور پاؤں میں پرانی پشاوری چپل......

''سر یہ آدمی کبھی آفس کے بلڈنگ کے سامنے بیٹھا ہوتا ہے، کبھی سڑک پار کر کے اور کبھی کالونی کے مین گیٹ کے پاس پچھلے ہفتے دس دن سے اس کا یہ ہی معمول ہے۔ مشکوک بندہ لگتا ہے۔''

''ہاں بھئی کیا نام ہے تمہارا؟''

''آپ کو میرے نام سے کیا لینا ہے؟''

''ہوں اچھا تم یہاں وہاں کیوں بیٹھے رہتے ہو۔''میں نے سادہ سے نرم لہجے میں پوچھا۔

''میں تو بس انتظار کرتا ہوں۔''

''کس کا انتظار؟''میں نے اسے پھر غور سے دیکھا۔ اگر یہ کوئی جاسوس یا ایجنٹ تھا تو بڑا کمال کا تھا...... چہرے پر کئی تاثر نہیں تھا۔ بے نیازی کی سی کیفیت نہ خوف نہ تردد، نہ صفائی پیش کرنے کا جذبہ......بس ایسے کہ جیسے ''مجھے تمہاری نہ کوئی پرواہے نہ کوئی خوف۔''

واہ بھئی کام کمال کا بندہ لگتا ہے! میں نے دل میں سوچا۔ فوجی ہیڈ کوارٹر کے پاس ایسی دیدہ دلیری کے ساتھ رہنا اور ذرا خوف نہ کھانا......

لیکن ابھی میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اس پر غور کرتا۔ شبیر کو اشارہ کیا۔

''مہمان بنانا ہے...... اور وہ بھی خاص لیکن میں آ کر اسے دیکھوں گا......اچھی طرح تلاشی لے لینا...... رپورٹ مظہر کو دینا...... باقی ویک اینڈ کے بعد آ کر بتاؤں گا۔''

ہونہہ ویک اینڈ بھی اپنی مرضی سے نہیں گزار

سکتے۔ میں نے سوچا، کل صبح کی فلائیٹ ہے لندن کی...... یہ سیاست دان اگر ملک کے اندر ہی اپنی جوڑ توڑ کی میٹنگ رکھ لیا کریں تو کتنا بھلا ہو...... ملک کا!! ہاں بھئی کون سا ٹکا وہ اپنی جیب سے خرچ کرتے ہیں۔ بوجھ تو ملکی خزانے پر ہی پڑتا ہے...... پھر بھلا یہ بھی کوئی تک ہے کہ ہم ان کے ساتھ ساتھ پھرتے رہیں...... لیکن نہیں بھئی ہم کون ہوتے ہیں اعتراض کرنے والے...... حکم تو حکم ہے، بجا آوری لازم......

''میں بھی چلوں گی......'' فرح تو سنتے ہیں بولی۔

میں نے اسے دیکھا ''حیرت ہے ایک فوجی کی بیوی ہو تم! ایسے دوروں میں فیملی کی اجازت نہیں ہوتی۔''

''اوہ ہو!! بھئی کیا فوجی کی بیوی روبوٹ ہوتی ہے؟''

''جانتی ہو پھر......'' میں نے جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

بیکار ہے کوئی بات بھی کرنا...... یہ وہ بھی جانتی ہے اور میں بھی۔ میں نے وارڈ روب سے دو سوٹ شرٹس اور دو پتلونیں نکال کر مسہری پر ڈال دیں...... ''پیکنگ کر دینا...... کل صبح کی فلائیٹ ہے میں ذرا اپنی فائلیں دیکھ لوں۔''

''بابا...... آپ پھرا کیلے جا رہے ہیں...... دوبئی کا وعدہ تھا......'' دروازے پر روشنا، عدیلہ اور فاران کھڑے تھے۔

''ہوں تم لوگ کیسے؟ سوئے نہیں۔''

''بابا ہم شب بخیر کہنے آئے تھے۔''

''وہ تو میں تمہارے پاس آتا ہوں نا......'' میں نے فاران کو گود میں اٹھایا۔ روشنا اور عدیلہ کو پیار کیا۔

''مجھے اپنا وعدہ یاد ہے...... انشاءاللہ جلد ہی چلیں گے۔'' میں نے انہیں بہلا کر سونے بھیجا۔

لندن میں یہ تیسرا دن تھا جب مجھے کچھ لمحوں کی فرحت ملی جب کہ ان سب کی اپنی اپنی مصروفیات تھیں، وہ بھی خاص...... جن کے لیے انہیں کچھ تنہائی نہیں بلکہ بالکل تنہائی درکار تھی۔ پاکستان میں اپنے دفتر کو رپورٹ کر کے میں نے بھی سکھ کا سانس لیا کہ انھوں نے میری ڈیوٹی کچھ اور طرح کی نہیں لگائی۔

موسم سرد نہ تھا، ہوا خوشگوار تھی لہٰذا لندن کی ڈبل ڈیکر سے پورے شہر کے نظارے کا سوچا۔ اور ایسی بس کا انتخاب کیا جس کی چھت کھلی تھی کہ سیڑھیاں چڑھ کر بس کی اوپر کی منزل پر بیٹھیں اور پورے لندن کا

خوبصورت منظر دیکھیں۔ ہلکی دھوپ میں بہت پرلطف لگ رہا تھا۔ لندن کی سڑکیں تنگ ہیں لیکن رش نہیں ہوتا۔ فٹ پاتھ پر جگہ جگہ لمبی لائن لگی تھی، سیل والی دکانوں پر لوگ صبر سے اپنی باری کا انتظار میں تھے۔ مادام تساؤ کا میوزیم پہلے کئی دفعہ دیکھ چکا تھا۔ داخلے کا چھوٹا سادروازہ جس کے باہر کی فٹ پاتھ پر غیر ملکی سیاح لائن لگائے اپنی باری کے لیے انتظار میں کھڑے تھے۔ بس سے گزرتے ہوئے میں نے اس جگہ کو پہچان لیا۔ باہر شرلاک ہومز کا طویل قامت مجسمہ لگا تھا اور لوگوں کی فٹ پاتھ پر لائن لگی تھی۔ ایک جگہ شیشے کے باہر طرح طرح کے ڈراؤنے ماسک، خون ٹپکتے کٹے ہوئے سر اور ٹانگیں نظر آ رہی تھیں اور وہی لمبی قطار تھی۔ خریداری کے لیے اندر جانے والوں کی۔ مجھے یاد آیا ان لوگوں کا ہیلووِن کا تہوار آنے والا ہے اسی ہفتے...... کتنی دلچسپی سے لوگ ان اشیا کی خریداری کے لیے لائن لگائے کھڑے تھے۔ کئی لوگوں کے ساتھ ان کے چھوٹے بچے انگلیاں پکڑے کھڑے تھے۔

ہمارے ہاں اس کا زیادہ شوق بڑوں کو ہے اور وہ بھی سیاست دانوں کو جنہیں اپنے عوام کو ڈرا دھمکا کر ڈرامے اور تھیٹر لگا کر قابو میں دکھنا ہوتا ہے۔ شوق عوام کو بھی ہے لیکن ڈرنے اور بیوقوف بننے کا...... سو بنتے رہتے ہیں۔ کوئی بننے کو تیار کوئی بنانے کو پھر بھلا جھگڑا کاہے کا ہے۔ جو کر رہے ہیں سو کر رہے ہیں۔ میں نے اپنے اونگھتے ہوئے ضمیر کو تھپکیاں دیتے ہوئے کہا۔

اگرچہ پچھلے پانچ چھ برس کے دوران معمول ہے کہ بیوقوف بنتے عوام میں سے کچھ کو جنہیں افسر شاہی مشکوک سمجھتی ہے یا دوسرے الفاظ میں جو عقل مند بننے کی کوشش کرتے ہیں غائب ہو جاتے ہیں۔ جیسے بارہ سنگھوں ہرنوں اور بھینسوں کے غول کے پیچھے لگے لکڑ بھگے...... کسی مناسب شکار کو موقع پاتے ہی غائب کر دیتے ہیں اور باقی غول خوف کے باعث افراتفری کا شکار کر تتر بتر ہو جاتا ہے۔ پکڑے جانے والے شکار کی ماں امید اور مایوسی کی ملی جلی کیفیت میں کچھ دیر شکاری کے پیچھے بھاگتی اور پھر تھک ہار کر دوبارہ تماشا دیکھتے ہوئے ریوڑ میں شامل ہو جاتی ہے۔ اور ریوڑ اپنی معمول کی مصروفیات میں مگن ہو جاتا ہے۔

ہیلووِن کے تہوار کے لیے تیاری کچھ دن ہی کی جاتی ہے۔ کھیل اور تفریح کے طور پر...... اور ہمارے سیاست دان امریکی دکان کے سامنے لائن لگا کر کھڑے ہوتے ہیں...... سالہا سال امریکی مفادات

کے امین بن کر......انکی دہشت گردی اور ڈرون حملوں کے حمایتی بن کر......قوم کے محبّ وطن بیٹوں کو کرنسی کے طور پر استعمال کرتے ہیں...... بھلا ڈاکٹر عافیہ کا قصور کیا تھا لیکن زبان بند ہے کہ بند رکھنے کا اشارہ ہوا ہے...... بدلے میں امریکی دکان سے انہیں اپنے اقتدار کا تحفظ درکار ہے...... امدادی رقوم جن کے ذریعے غربت اور بھوک کے مارے عوام کے لیے روٹی کا نہیں بلکہ اپنے اقتدار کے دوام کے لیے ووٹوں کی خریداری اور میڈیا کی حمایت کا حصول درکار ہے۔ اپنے خاندان اپنے سرمائے اور اپنے کاروبار کے لیے پوری قوم کی غلامی پر راضی برضا......لیکن نہیں جانتے کہ وہ اس شاخ پر وار کر رہے ہیں جس پر خود بیٹھے ہیں۔

بات وہ ہی ہے کہ استعمال کرنے والوں سے زیادہ قصور استعمال ہونے والوں کا ہے آخر ایسا کیوں ہے کہ کسی ادارے کا کارکن غائب ہوتا ہے تو ادارے کو اپنی ریپوٹیشن کا مسئلہ زیادہ اہم لگتا ہے کوئی صحافی غائب ہوتا ہے تو یہ صرف متعلقہ چینل کے لیے اہم ہوتا ہے اور وہ بھی صرف اس لیے کہ متعلقہ خبر کے ذریعے ریٹنگ کو کچھ اور اوپر لے جایا جائے۔ سیاست دان کسی فرد کے غائب ہونے پر اپنی پارٹی کی لسٹوں کا جائزہ لے کر بیان جاری کرتے ہیں۔ پولیس کو صرف پیسے سے سروکار ہوتا ہے نہ ایف آئی آر درج کرنے سے دلچسپی ہوتی ہے نہ مقصد کو آگے چلانے کا سوچتی ہے......اور ایک محترم طبقہ سول سوسائٹی کا رہا تو انہیں اس طرح کے معاملات سے احتیاط برتنا ہی بھلا لگتا ہے۔ دائیں بائیں دیکھ کر ہر شخص اپنے بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے اور سر جھکا کر روزمرہ کے معمولات میں مصروف ہو جاتا ہے۔

جیسے ہرن بارہ سنگا اور بھینسوں کے ریوڑ اپنے کسی ساتھی کا شکار ہو جانے کے کچھ ہی دیر بعد پرسکون ہو کر اجتماعی طور پر گھاس چرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

آخر مجھے بھی ساری بقراطی اسی لیے سوجھ رہی ہے کہ اب نظرِ کرم گاہے بگاہے ''منظّم ریوڑ'' کی جانب بھی ہو رہی ہے۔ حکومتی پالیسیوں پر تنقید، غیر ملکیوں سے روابط اور خانہ جنگی کا الزام لگا کر غائب کیا جا رہا ہے...... نہ چارج شیٹ، نہ مقدمہ......اگر قسمت اچھی ہوئی تو کچھ ماہ حراست کے بعد نوکری سے برخاستگی اور رہائی...... ورنہ کرنل عبدالغفار، میجر روحیل اور میجر عطاالله کی قسمت اچھی تھی۔ ورنہ......لندن کی فضاؤں

سے تصور ہی تصور میں کال کوٹھریوں، تہہ خانوں کے جیل خانوں میں پہنچ گیا......خوف کی ایک جھرجھری سی بدن میں سرایت کرگئی......اور میں نے جلدی سے سر جھٹک کر خیالوں سے نجات پائی۔ اردگرد نظر ڈالی۔

بس اب لندن ٹاور کے پاس سے گزر رہی تھی۔ انگریز بادشاہوں کی قلعہ نما رہائش گاہیں......انگریزوں کے پہلے بادشاہ کا دور 1066ء-1087ء تک ہے۔ یہ بات مجھے یاد رہ گئی تھی کیونکہ پچھلی بار ٹاور آف لندن کی سیر کرتے کرتے مجھے لال قلعہ اور شاہی قلعہ بہت یاد آئے تھے۔ ہندوستان کے بادشاہوں کی قلعہ نما رہائش گاہیں......آج بھی وہاں جائیں تو ایک ہیبت سی محسوس ہوتی ہے......بلند اور وسیع......کاریگری میں بے مثال......سن اور تاریخ آس پاس ہے لیکن ٹاور آف لندن ساری سجاوٹ اور دیکھ بھال کے باوجود ایک بالکل مختلف تاثر چھوڑتا ہے۔

دماغ میں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ ہم ایک انتہائی بلند پایہ تاریخ رکھنے والی بہتر مضبوط اور بہادر قوم کے امین ہونے کے باوجود بار بار غلامی کی طرف کیوں چلے جاتے ہیں۔

آزاد ہونے کے بعد پھر غلام بننا اور بنے رہنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ دراصل ہمارے ذہن غلام ہوگئے ہیں۔ ذہنوں کو غلامی سے نجات اسی صورت میں مل سکتی ہے جب ہم اپنی اصل اور بنیاد کی طرف پلٹیں......اس پر شرمانے اور جھجکنے کے بجائے فخر محسوس کریں......معمولی سی مثال ہے میرا بیٹا میری انگریزی کے تلفظ میں غلطیاں نکالتا ہے تو میں دل میں خوش ہوتا ہوں کہ کیا زبردست انگریزی بولتا ہے۔ اور اس کے غلط اردو کے ہجوں پر اسے نہیں ٹوکتا...... بلکہ اس کی ماں اپنی سہیلیوں میں فخر یہ کہتی ہے۔ ''میرے بیٹے کو اردو بولنا نہیں آتی۔'' آخر ہم کس قوم کے فرد اور کس ملک کے نمائندے ہیں؟

لندن میں تین کے بجائے چار دن لگا دیئے گئے......شاید جوڑ توڑ میں کچھ کسر رہ گئی تھی۔ پیر صاحب سے الوداعی ملاقات اور اجازت کے بعد واپسی کا ارادہ کیا گیا۔

ہمیشہ ہی واپسی کے بعد دفتر کا پہلا دن انتہائی مصروف ہوتا ہے۔ پتہ ہی نہیں چلا شام کیسے ہوئی۔ فرح کا فون آیا ''آخر کہاں ہیں؟''

''آ رہا ہوں بھئی......آ رہا ہوں۔'' میں نے فون رکھا، شبیر سر پر کھڑا تھا۔ ''کیا بات ہے شبیر؟''

''سر آپ کے مہمان کا کیا کرنا ہے؟''

''مہمان؟'' مجھے فوراً ہی یاد آ گیا۔ ''کچھ بتایا اس

نے؟''

''نہیں سر! بڑا پکا ہے۔ کچھ نہیں پھوٹا...... کہتا ہے عتیق کا ساتھی ہوں...... وہ تو تم ہی لوگوں کے پاس ہے۔''

''بلاؤ اس کو میں بھی دیکھوں کتنا بڑا جاسوس ہے اور کس کے لیے کام کر رہا ہے۔ کوئی ایک دو تو نہیں...... دشمن بھی اور دوست نما دشمن بھی......''

کچھ دیر میں دو سپاہی اسے پکڑ کر لائے۔ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اس نے کمرے میں قدم رکھا۔ اچھی خاصی خاطر داری کی گئی تھی لیکن چہرے پر وہ ہی عجیب بے نیازی تھی۔ لگتا تھا اسے کسی چیز کی پروا ہی نہیں ہے۔

''ہوں کیا بات ہے...... بولتے کیوں نہیں ہو؟'' میں نے درشت لہجے میں مخاطب کیا۔

''کیا بتاؤں؟ بتاتا تو ہوں عتیق الرحمٰن کا ساتھی ہوں۔ اس کی ماں اور باپ دونوں بیٹے کی گمشدگی کے بعد سے ذہنی مریض بن گئے۔ بتاؤ کہاں ہے وہ؟''

میں نہیں، وہ مجھ سے سوال کر رہا تھا۔

''عتیق پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ اس کا باپ بوڑھا ہے......''

''اچھا لیکن تم کس لیے بیٹھے رہتے ہو...... کس کی جاسوسی کر رہے تھے؟''

''ہونہہ...... میں...... میرے تو دونوں بھائی مار دیئے...... ماں باپ دونوں ختم ہو گئے، اب تو مجھے بس انتظار ہے......'' مکمل سکون سے وہ بے نیاز لہجے میں بولا۔

''انتظار...... کس چیز کا؟''

''خدا کی پکڑ کا...... مظلوم کی داد رسی دیکھو کب ہوتی ہے!!''

اس نے اپنی انتہائی سرخ آنکھوں کے ساتھ مجھے غور سے دیکھا۔ اس کے لہجے میں نہ خوف تھا نہ تردد نہ صفائی پیش کرنے کا جذبہ...... لہجہ برفیلا تھا...... ایک کپکپاہٹ سی دل سے نکل کر گویا جسم کے ایک ایک حصے پر طاری ہو گئی۔ قدموں نے بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا۔ میں کرسی پر گر سا گیا۔

دل نے دعا کی الٰہی! ہمیں اپنی پکڑ اور مظلوم کی بددعا سے بچا لیجیے!

(☆ قید اور لاپتہ ہونے والے تمام افراد کے نام اصلی ہیں)

☆☆☆

پھراس کے بعد کا منظر بڑا سہانا ہے

''اُف......اُف میرے خدایا''، مسلم نے جھلا کر کہا۔ میرے بس میں ہوتو میں یہ نئی نویلی زیرو میٹر گاڑی واپڈا کے اس کھمبے سے یا ٹیلی نار کے سامنے والے پول سے ٹکرادوں۔ یا پھر...... یا پھر اس نے سارا غصہ گاڑی پر نکالا۔ دایاں ہاتھ سٹیرنگ پر بائیں ہاتھ سے بال قابو کیے ہوئے تھے۔

''امی جان آپ ایسی کیوں ہیں؟'' بے بسی سے مسلم نے کہا'' آپ کوتو پانی میں نمک مرچ بھی گھول کر دے دیں تو آپ ارشاد فرمائیں گی۔ بہت مزے کا ہے۔ بھلا یہ کوئی بات ہے؟ اچھی چیز کی تو بندہ تعریف کرے کون کافر منع کرتا ہے لیکن اتنی بری سروس اور بدمزہ کھانوں کی تعریف......توبہ توبہ......اس نے بایاں ہاتھ کان کو لگایا۔''

سلمٰی مسکرا کر بیٹے اور بیٹے کے جوشیلے پن کو دیکھتی رہی، پچھلی سیٹ سے عاتکہ نے لقمہ دیا۔

''بھیا یہی نہیں کہ تعریف پر بس کر جائیں، آتے ہوئے مٹھی میں لال پیلا نوٹ بھی تھما آتی ہیں۔ اب کوئی بتائے، عظیمی صاحب نے یہ کھانا دیا تھا یا الیکشن میں ہارنے کا بدلہ لیا تھا۔''

نسیمہ کیوں پیچھے رہتی؟ بولی'' اور جب سوپ آیا تو یقین مانیں میں......''نسیمہ نے جھرجھری سی لی۔'' اللہ معاف کرے، میں سمجھی کہ یہ......استغفراللہ......'' اس نے ایک اور جھرجھری لی۔

ایسی بری شکل تھی سوپ کی کہ میں تو برے دل کے ساتھ واپس اپنی چیئر پر آ گئی۔ ہر بندہ بشر کھانے کی پلیٹ میں کھانے کی پہاڑیاں بنا کر واپس وہ پہاڑیاں ہی رکھ آیا۔ سلاد میں عجیب سی سمیل آ رہی تھی، بریانی کے چاول اتنے کچے جیسے کوئی چنے چبا رہا ہو۔ ٹرائفل میں مکھی نظر آ رہی تھی۔ ہماری امی اسے بھی الائچی سمجھ کر تعریف کر دیں گی......''

سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے اپنی زندگی میں سے وہ واقعات نکال نکال کر ایک دوسرے کو سنا رہے تھے۔ جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح امی کی لذت طعام سے نا آشنائی کا تھا۔

”ویسے ایک بات ہے۔مسلم ہنسا، امی جان ہم آپ کی موجودگی میں آپ کو ڈسکس کر رہے ہیں، یہ غیبت تو نہیں ہو رہی ناں......“امی کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی۔

”آج کے بعد یہ طے ہوگیا ہے کہ ہم نے کسی نہ کسی بہانے کسی بھی فنکشن پر جانے سے پہلے کھانے کا مینو ضرور پوچھنا ہے۔ورنہ روزہ رکھ کر جائیں،ثواب کا ثواب اور غیبت سے بچت، نسیمہ نے کہا۔”میں تو پچھتا رہی ہوں اسی کلومیٹر کا سفر کر کے بندہ جائے، سلامی کے کڑکڑاتے ہوئے نیلے نوٹ بھی ان کے حوالے کرے اور کھانے کے نام پر اللہ جانے کیا مِلے ...... میں تو بس ایک کوک ہی پی سکی کوئی چیز بھی ٹیسٹ کرنے کو دل نہیں مان رہا تھا۔“

”ایک بات سچ سچ بتائیں امی......“ مسلم نے ماں کو دیکھ کر کہا۔

ماں کے ہلتے لب لمحہ بھر کے لیے ساکت ہوگئے، نظریں سوالیہ تھیں۔

”کیا آپ شروع سے ایسی ہیں؟ میرا مطلب کھانے کے معاملہ میں اتنی ہی کور ذوق...... جو ملے جیسے ملے بس چپ چاپ کھالو......کبھی کھانا برا نہیں لگا؟ یا ذائقہ کی حس ہی کہیں مرمرا گئی ہے۔“ سالہا سال سے ذہن میں کلبلاتا سوال بالآخر زبان کی نوک پر آہی گیا۔

امی کی عینک میں دھند سی آئی جسے انہوں نے صاف کیا۔آنکھوں کے گوشے صاف کیے اور بولیں۔

”بچو! یہ وہ دکھ ہے یا وہ راز ہے جو میں بہت دیر سے آپ سے شیئر کرنا چاہ رہی تھی۔تم لوگ خود سوچو اپنے زمانے کی بہترین کھلاڑی، ڈبیٹر، صنعتکار گھرانے میں پیدا ہونے والی چار بھائیوں کی اکلوتی بہن کو کھانے کا بھی ذوق نہ ہو؟

یہ بات نہیں۔ جسے تم ذوق کہہ رہے ہو یہی ”کور ذوقی“ ہے یہی دل کی تنگی اور پرلے درجے کی ناشکری اور احسان فراموشی ہے!“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ مسلم نے پہلو بدلا۔

”مطلب تو بیٹے میں نہیں جانتی مجھے بس اتنا پتا ہے کہ کھانے کے معاملہ میں مجھ سے زیادہ خوش ذوق کوئی نہیں تھا۔کون سی ڈش کیسے بنتی ہے ہوٹل مینجمنٹ کے کورسز تو اب شروع ہوئے ہیں مجھ سے کوئی پوچھے میں سادہ دال بھی بناتی تھی تو کس طرح سلاد پودینے کی چٹنی رائتہ اچار اور دس طرح سے سجا بنا کے

پیش کرتی تھی۔ کھانے میں ذرہ بھر کمی رہ جاتی تو وہ باؤل اس سالن سمیت پٹخ دیا جاتا۔ مختلف چینلز پر آج کل جو کھانا پکانے کے پروگرام اور کمپی ٹیشن ہوتے ہیں اس وقت یہ صورت حال نہیں تھی، اس کے باوجود جب مجھے کھانا پکانے اور پیش کرنے کے موضوع پر بولنے کا کہا جاتا تو یوں لگتا تھا جیسے زبان کا ٹانکا ٹوٹ گیا ہے۔ ریڈیو پر بے شمار انعامات اسی سلسلہ میں جیتے اور فخریہ کارکردگی کے طور پر سنبھال کر رکھے۔ پھر......پھر......''

امی نے ایک لمبا سا ٹھنڈا بے جان اور دکھ میں ڈوبا سانس لیا۔ ان کی آنکھوں میں ہیرے چمک رہے تھے۔ وہ بولیں۔

''پھر ایک دن ایسے ہی فراغت کے عالم میں کسی اخبار کا سنڈے میگزین اٹھایا، نیا تھا یا پرانا، یہ بھی نہ دیکھا۔ آنکھوں نے دیکھا تو بس ایک ہی سین، کسی ملک کے قحط زدہ بچوں کی تصویر جن کے ہاتھوں میں خالی پیالے اور بھوک ایک چڑیل کی طرح ان کے ساتھ چمٹی تھی۔ اسی میگزین میں جب میرا یہ منظر دیکھ کر دل ہل گیا تھا، میں نے ایک آرٹیکل دیکھا لکھا تھا۔ ''محبوب خدا کے گھر میں مدینہ جا کر کبھی بھی تین دن ایسے مسلسل نہیں آئے تھے کہ اُنؐ کے ہاں گندم کی روٹی پکی ہو۔ بسا اوقات دو دو ماہ چولھا نہ جلتا، بس ایک دفعہ گندم آئی، اماں عائشہؓ نے آٹا پیس کر روٹی پکائی۔ گھر میں زیتون کا تیل پڑا تھا، اس سے روٹی چپڑ لی اور سوکنوں کے ہاں پیالہ بھیج کر سالن منگوانا چاہ رہی ہیں۔ آپؐ سے عرض کیا تو حیرانی سے بولے۔

''عائشہؓ! جب روٹی زیتون کے تیل سے چپڑی ہو تو کیا سالن کی ضرورت رہ جاتی ہے۔''

امی یہ کہہ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

مسلم نے گاڑی کی سپیڈ چالیس کر دی۔ آنسو پونچھتے ہوئے امی نے کہا۔

''کیا تم یقین کرو گے اس لمحہ مجھے پتہ نہیں کیا ہوا...... میں نے سوچا ...... میں نے سوچا میں اس کیفیت کو کیسے دیکھوں جب دو ماہ روٹی نظر نہ آئے تو انسانی وجود پر طاری ہوتی ہے۔ میں نے سوچا میں بھی پورے دو ماہ صرف پانی دودھ یا کبھی کبھار کیلے سیب پر گزارہ کروں۔ صبح ناشتے میں حلوہ پوری سے لیکر جام بریڈ تک ہر قسم کی ورائٹی لازمی ہوتی تھی، میں کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاتی۔

گھر والے دو چار دن دیکھنے کے بعد ڈاکٹر کے پاس لے گئے اور کہا اسے بھوک نہیں لگتی، ڈاکٹر صاحب

نے دس طرح کے ٹیسٹ لکھ کر دیے۔ میں نے ساری ادویات پھینک دیں۔عزیز و اقارب میں کئی شادیاں آئیں۔کئی تقریبات ہوئیں لیکن میں نے ہر نعمت سے منہ موڑے رکھا۔بمشکل دس دن صرف دس دن......''

امی پھر رو پڑیں ''دس دن کے بعد میری حال یہ تھی کہ میرا دل چاہتا تھا کہ جو کچھ کھایا جا رہا ہے میں نوچ لوں۔گیارہویں دن جب روٹی بنی، میں نے اسے گھی سے چپڑ کے اپنے کمرے میں سادہ پانی کے ساتھ کھایا۔ اور ...... اور ...... ہر لقمہ...... دنیا کی بڑی نعمت بنتا گیا۔ ہر لقمہ کی لذت پہلے سے جدا ہوتی۔اس روٹی کو دیکھ کر مجھے پتہ تھا یہ وہ روٹی نہیں...... وہ تو موٹی روٹیوں،لکڑی کے ایندھن پر اینٹوں کے چولھے پر پکی روٹیوں اور سوئی گیس کے چولھے پر خانساماں کے ہاتھ پکے پھلکوں میں بہت فرق ہے پھر بھی۔اس روٹی کو کھانے سے پہلے شوق اور رغبت نے مجھے بے حال کر رکھا تھا۔وہ روٹی میں نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ شکر بھرے دل کے ساتھ کھائی۔صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ جس دن میرے آقاؐ کے ہاں روٹی پکتی ہوگی اور تیل سے چپڑی ہوتی ہوگی ان کا دسترخوان کیسا لگتا ہوگا؟''

''اس دن کے بعد کھانے پینے کی تمام ڈشیں میرے لیے ایک ہی ذائقے پر مشتمل ہوگئی ہیں، فائیو سٹار ہوٹل ہو یا شہر کا سب سے اعلیٰ ریسٹورنٹ۔ سب کے ذائقے مصنوعی لگتے ہیں۔اصل لذت بھرا کھانا تو بس سادہ روٹی اور شکر ملا دودھ کا پیالہ...... شکر کے جذبات سے بھرا لبریز دل ہے۔''

''اب بتاؤ مجھے کیا میرا تجربہ غلط ہے؟ کیا کھانے پینے کی چیزوں پر انتہائی قیمتی وقت برباد کرنا اور بغیر احساس کے بولتے چلے جانا زندگی کا ضیاع نہیں؟''

اب امی سوالیہ نظروں سے اپنے تینوں بچوں کو دیکھ رہی تھیں۔اور تینوں کا دل چاہ رہا تھا اپنی ماں کے ہاتھ ہی نہیں قدم بھی چوم لیں۔آج انہیں اپنے دیرینہ سوال کا جواب بھی مل گیا تھا کہ کھانے پینے اوڑھنے کے موضوعات پر امی کے ہونٹ کیوں ساکت ہوجاتے ہیں۔مسلم نے ہمت کر کے امی کے ہاتھ کی پشت پر پیار سے اپنا منہ رکھ دیا۔اس کے آنسو امی کے ہاتھ بھگو رہے تھے اور امی بس یہی کہہ رہی تھیں۔

''صلی اللہ علیہ وسلم ......صلی اللہ علیہ وسلم''

☆☆☆

لو میرج

فون کی گھنٹی بجی رات کے گیارہ بجے، میں نے ٹیبل لیمپ آن کیا گھڑی پر نگاہ پڑی یقیناً یہ کسی اجنبی کی دوسرے ملک سے کال ہو گی کیونکہ جاننے والے ساڑھے نو بجے کے بعد فون نہیں کرتے۔ انھیں علم ہے کہ اس کے بعد میں سو جاتی ہوں یا کوئی ایمرجنسی لیکن جب ہسپتال چھوڑا ایمرجنسی بھی خواب و خیال ہوئی۔ فون اٹھایا۔ ''ہیلو...... ہیلو...... جی ڈاکٹر نقوی سے بات کرنی ہے۔''

''السلام علیکم، بسم اللہ جی، میں بول رہی ہوں فرمایئے آپ؟''

انھوں نے میری بات کاٹ دی۔

''میں یو کے برمنگھم سے عدنان بول رہا ہوں۔ سخت پریشان ہوں مسئلہ ہی ایسا ہے کسی نے آپ کا نمبر دیا ہے۔''

''میں رات کو بہت کم بات کرتی ہوں لیکن اگر معاملہ ایسا ہی نازک ہے تو آج نیند قربان ...... آپ فرمایئے میں آپ کے کس کام آ سکتی ہوں۔''

''میری اپنی بیوی سے لڑائی ہو گئی ہے...... اور میں نے غصے میں اسے بہت برا بھلا کہہ دیا ہے۔ ابھی میرا نکاح ہوا ہے۔ رخصتی نہیں ہوئی۔''

''تو لڑکی اپنے والدین کے گھر ہو گی۔ لڑائی کا کیا سوال...... آپ لڑنے کے لیے وہاں گئے تھے وہ بھی اس وقت......؟''

''نہیں وہ یہاں لڑکیوں کے ہوسٹل میں رہتی ہے۔ پی ایچ ڈی کرنے آئی ہوئی ہے۔ میں بھی پڑھنے آیا ہوں ساتھ جاب بھی کر رہا ہوں۔ ہم اکثر ملتے ہیں، ساتھ کھانا کھاتے ہیں، فلم دیکھنے جاتے ہیں۔ اسے یونیورسٹی سے میں ہی پک کرتا ہوں۔''

''لیکن یورپین ممالک میں یہ سب روٹین ہے اس میں لڑائی کہاں سے آ گئی۔''

''دراصل اب وہ مجھ پر بھروسا نہیں کرتی۔ کہتی ہے آپ مجھے چھوڑ دیں گے۔''

''کوئی وجہ......؟'' میرا لہجہ سوالیہ تھا۔

''بس اسے اعتبار نہیں رہا۔'' وہ بے چارگی سے

بولا۔

''لیکن آپ اسے یقین دلا سکتے ہیں۔ میری بات کا وہ یقین کیسے کرے گی جبکہ وہ مجھے جانتی تک نہیں ہے۔ ایسا کریں کل یونیورسٹی سے فارغ ہو کر آپ کانفرنس کال کریں۔ آپ دونوں بیک وقت موجود ہوں ۔ بات کریں۔ میرے سوالوں کے جواب دیں پھر صلح کی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔ ابھی تک تو مجھے لڑائی کی وجہ ہی معلوم نہیں ہوسکی۔ میں کیا ثالثی اختیار کروں۔''

''دراصل جی ڈاکٹر صاحبہ ہماری ''لو میرج'' ہے......''اس نے جیسے جرم کا اقبال کیا۔

''پھر تو اور بھی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے کہ نباہ بھی آپ دونوں نے کرنا ہے کیونکہ یہ گھر والوں کا فیصلہ نہ تھا آپ کا اپنا فیصلہ تھا۔''

''بات تو ٹھیک ہے میں اسے چھوڑنا نہیں چاہتا لیکن وہ اب لڑتی ہے میری بات نہیں مانتی۔''

''اچھا کل آسٹریلیا کے ڈھائی بجے دن کے وقت نماز ظہر کے بعد فون کیجیے گا۔ اور کانفرنس کال ہو ۔خدا حافظ''اور فون بند ہو گیا۔

نیند تو اڑن چھو ہو گئی تھی ایک کتاب نکالی اور مطالعہ کرنے کا موڈ بنایا۔ لیکن کانوں میں عدنان کی باتیں ری پلے ہو رہی تھیں۔ مشورہ دینے والی کی بڑی ذمہ داری ہوتی ہے ۔ اے میرے رب مجھے علم، حکمت اور بصیرت عطا فرما اور میرے الفاظ میں تاثیر پیدا کر دے، توفیق دے دو زندگیوں کو بچانے کی۔ میں یہ دعا مانگ کر مطمئن ہو کر سو گئی۔ اب معاملہ اللہ کی عدالت میں بلکہ رحمت کے زیرِ نگیں چلا گیا۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہی ہو گا۔

دوسرے دن مقررہ وقت پر کال آ گئی۔ لڑکی کا نام فائزہ تھا۔ اس نے بات شروع کی۔

''السلام علیکم میں فائزہ بول رہی ہوں۔''

''وعلیکم السلام میں ڈاکٹر نقوی ہوں۔ آپ تھوڑی سی ہسٹری مجھے ضرور بتا دیں پھر ہم پرابلم ڈسکس کریں گے۔''

''میرا نام فائزہ ہے۔ میں کراچی کی میمن فیملی سے ہوں ۔ یہاں پی ایچ ڈی کر رہی ہوں۔ ڈیڑھ سال گزر گیا ہے ابھی ایک سال باقی ہے۔ میری تین بہنیں اور تین بھائی ہیں۔ دو کی شادی ہو گئی ہے باقی ابھی پڑھ رہے ہیں۔ بڑے بھائی کی بھی شادی ہو گئی ہے۔ سب کی شادیاں اپنی برادری میں ہوئی ہیں۔

ہماری ملاقات نیٹ پر ہوئی تھی اس بات کو دس سال ہو گئے ہیں۔ اس وقت میں میٹرک میں تھی پہلے تو یونہی چٹ چیٹ ہوتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ ہم سیریس ہو گئے اور ہمیں محسوس ہوا کہ ہمارے آئیڈیاز اور سوچ کا انداز ملتا جلتا ہے، ہم اچھے لائف پارٹنر بن سکتے ہیں۔ تب ہم نے گھر والوں کو بتا دیا۔ میری فیملی والے معترض تھے کہ ہم نے پنجابیوں میں شادی نہیں کرنی۔ یہی حال عدنان کے گھر والوں کا تھا۔ ہمیں چار سال لگے انھیں منانے میں۔ پھر دونوں خاندان مان گئے اور ہمارا نکاح ہو گیا۔ طے یہ پایا کہ پی ایچ ڈی کے بعد رخصتی ہو جائے گی۔ میں یو کے پڑھنے کے لیے آ گئی۔''

''اچھا اب عدنان تم بتاؤ۔ اس میں کچھ اضافہ یا کمی کرنا چاہو گے۔'' میں نے کہا۔

''ہم ذات برادری کے جٹ ہیں میں سات بہنوں کا اکلوتا بھائی ہوں۔ ایک چھوٹا بھائی تھا جس کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا ہے۔ میرے والدین اپنے خاندان میں یا اپنی برادری میں شادی کرنا چاہتے تھے لیکن میری ضد اور اصرار پر وہ اس رشتے پر راضی ہو گئے۔ حالانکہ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ فائزہ ٹھیک کہہ رہی ہے ہمیں ان کو منانے میں بہت عرصہ تقریباً چار پانچ سال لگ گئے ہم چاہتے تھے کہ والدین کی اجازت اور دعاؤں کے ساتھ ہم نئی زندگی شروع کریں۔ یہاں میں پہلے آیا۔ فائزہ بھی پڑھنا چاہتی تھی اور چونکہ میں یہاں تھا تو اسے بھی اجازت مل گئی۔''

''اچھا یہاں آ کر لڑائی کیسے شروع ہوئی؟''

فائزہ بولی۔''سب سے پہلے انھوں نے میرے لباس پر اعتراض کیا۔ میں نے یہاں آ کر پینٹ اور قمیص پہن لی جو یہاں کا کامن لباس ہے اس طرح بندہ سنگل آؤٹ نہیں ہوتا۔ لیکن انھوں نے مجھے پہلی دفعہ ڈانٹا کہ میں اتنا تنگ لباس نہ پہنوں اور سر پر حجاب لے کر یونیورسٹی جایا کروں۔ میں نے مان لیا۔ پھر ایک روز میں نے عدنان کو پانچ بجے کا ٹائم دیا تھا وہ میرا انتظار کرتے رہے۔ کلاس کے بعد کچھ ٹیچرز کے ساتھ ڈسکشن تھی دیر ہو گئی عدنان نے مجھے بہت ڈانٹا۔ میں رونے لگی کہ کبھی دیر ہو ہی جاتی ہے مجھے کیا پتہ تھا میں نے غصے سے کہہ دیا کہ اتنا صبر بھی نہیں ہو سکتا تو مجھے لینے نہ آیا کریں۔ میں ٹرام پہ آ جایا کروں گی۔ کہنے لگے تم میرے ساتھ آنا نہیں چاہتی تو پھر

کس کے ساتھ آیا کرو گی؟ میں نے کہا آپ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔بس اس طرح ہماری بات بڑھ گئی۔

دو دن ہماری بات چیت بند رہی پھر انھوں نے مجھے بلا لیا اور میں نے معاف کر دیا۔ کہنے لگے اب ایسا نہیں بولوں گا۔ میں نے اپنی بہن اور بھائی کو فون کر دیا تھا کہ میری عدنان سے لڑائی ہو گئی ہے آپ ان سے بات کریں۔عدنان نے صلح کے بعد پھر ڈانٹا کہ ان کو فون کر کے کیوں بتایا سارے خاندان میں یہ بات ہر جگہ پھیل جائے گی۔ میں پریشان ہو گئی تھی مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں میں نے اپنی بہن کو بتا دیا۔اب عدنان نے کہا کہ تمھاری بہن تمھیں پٹیاں پڑھاتی ہے تم اس سے بات نہ کرو۔ میں نے واقعی اسے فون کرنا چھوڑ دیا لیکن ان کو یقین نہیں آیا کہتے ہیں تم اب بھی فون کرتی ہو میں کیسے بتاؤں۔'' یہ کہہ کر وہ رونے لگ گئی۔

پھر عدنان بولا: ''بس یہ بھی بتاؤ نا کہ تم دن میں چار دفعہ کہتی ہو کہ آپ مجھے چھوڑ دیں گے میں ہرگز چھوڑنا نہیں چاہتا۔''

اب فائزہ بولی ''اور یہ بھی بتائیں کہ آپ غصے میں دو دفعہ طلاق دے چکے ہیں۔''

میں یہ سن کر سناٹے میں آ گئی۔

''عدنان ...... یہ بات تو آپ نے مجھے نہیں بتائی۔''

''میں ضرور بتاتا لیکن مجھے شرم آ رہی تھی بتاتے ہوئے......''

''اور جب دونوں خاندانوں کو علم ہو گا۔آپ کے دوستوں اور رشتے داروں کو پتہ چلے گا تو پھر کیا ہو گا۔ میں تو صرف فون پر ہوں، جھگڑے کی جو وجوہات آپ نے بتائی ہیں وہ تو ایسی ہرگز نہیں ہیں کہ نوبت طلاق تک آ جائے۔''

عدنان نے ہمت کی ''دراصل میرے ابا جان بہت بیمار تھے۔ان کے دماغ میں ٹیومر تھا۔ان کی سرجری ہوئی، دو ماہ ہسپتال رہے۔ فائزہ کے بڑے بھائی انہیں دیکھنے آئے تھے۔ دو دن ہمارے گھر بھی انہیں دیکھنے آتے رہے۔لیکن ان کی امی کو فون کر کے خیریت دریافت کرنی چاہیے تھی۔''

''امی نے فون کیا تھا۔'' فائزہ بولی ''کئی بار کیا تھا،لیکن کوئی فون نہیں اٹھاتا تھا یا اٹینڈ نہیں کرتے تھے۔آپ سی ایل آئی میں دیکھ لیں کہ کراچی کی کتنی

کالیں ہیں مگر عدنان کو اعتبار نہیں آتا۔''

میں نے کہا ''اور کوئی شکایت ......''

فائزہ بولی ''ان کی تنخواہ کم ہوگئی ہے تو کہنے لگے تم منحوس ہو۔'' میں کچھ نہ بولی لیکن میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں جلدی سے باتھ روم چلی گئی تاکہ عدنان میرے آنسو نہ دیکھ لیں۔ میں نے سوچا میں فریش ہو کر آتی ہوں۔

انہوں نے باتھ روم کے دروازے پر دستک دینی شروع کر دی زور زور سے...... میں نے کہا آتی ہوں۔ باہر نکلی تو انہوں نے سختی سے میرا بازو پکڑا۔ میں نے کہا آپ نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تو میں پولیس کو بلا لونگی۔ میں نے پولیس کو فون کر دیا۔ اب عدنان کہنے لگے کہ اگر پولیس آ گئی تو نیشنلیٹی کا کیس کمزور پڑ جائے گا۔ پوائنٹس کٹ جائیں گے۔ اب تم فون کر کے کہو کہ نہ آئے ہماری صلح ہوگئی ہے۔

میں نے فون کیا تو جواب ملا کہ اب تو پولیس چلی گئی ہے۔

اس وقت انہوں نے کہا کہ تم نے مجھے ذلیل کر دیا ہے اور کہا میں نے تمہیں طلاق دی۔ اوپر سے پولیس آ گئی۔ ہم نے کہا ہماری صلح ہوگئی ہے۔ اب کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن وہ نام نمبر ایڈریس لکھ کر لے گئے۔

اب حالات اس نہج پر آ گئے ہیں میڈم کہ مجھے تو نباہ مشکل لگتا ہے۔'' انہوں نے بغیر سوچے سمجھے دو دفعہ طلاق دے دی۔''

''اب تم دونوں میری سنو!

شادی، خاندان کی بنیاد ہے، پروردگار عالم کا حکم اور سنت رسولؐ ہے۔ اور محبت کا شہد اس میں شامل ہو جائے تو یہ کامیابی کی معراج ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ آج کل کے بچے یا جوان جو وقتی جذباتیت کو محبت کا نام دے دیتے ہیں وہ اس کے مفہوم سے ناواقف ہیں۔ محبت تو ایثار کا دوسرا نام ہے کچھ دینے کا نام ہے پانے کا نہیں ہے۔ خاندانی زندگی میں شادی کے پودے کو ہر روز ایثار و محبت، صبر اور برداشت کا پانی سیراب کرتا ہے تب اس پر خوشی کا مرانی اور سکون کے پھول کھلتے ہیں۔ آپ دونوں سوچیں کہ آپ نے اس مقدس جذبے کو کیسا ذلیل اور چھچھلا بنا دیا ہے۔ ابھی پورے طریقے سے شادی کی ابتدا نہیں ہوئی اور آپ نے اپنی محبت کا گلہ گھونٹ کر اس کا جنازہ نکال دیا۔ خاندان اور جاننے والے سنیں

گے جن کو منانے میں چار سال کا عرصہ لگا۔ آپ نے تو اتنا بھی نہیں نبھایا۔ بنیاد رکھی ہی نہیں اور مضبوطی کی بجائے کھوکھلا کر دیا۔ آپ کو تو کبھی ایک دوسرے سے محبت نہیں تھی۔ محبوب کی عزت کی جاتی ہے۔ آپ کے اس تعلق میں عزت، اعتبار، یقین اور برداشت نام کو نہیں ہے۔ ذرا سی تلخی مزاج میں آئی تو انتہائی الفاظ منہ سے نکال دیتے ہو۔ حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناگوار چیز طلاق ہے۔ یہ لفظ زبان سے نکالنا آسان ہے لیکن اس کے بعد دونوں کی زندگیاں داغدار ہو جائیں گی۔ طلاق کے بعد اس معاشرے میں دونوں کی دوسری شادی ایک مسئلہ بن جائے گی۔ ایسا بھول کر بھی نہ سوچیں۔ آنے والی نسلوں کو آپ اپنے رویے، کردار، اخلاق اور فیصلے سے یہ درس دے رہے ہیں کہ محبت، شادی اور طلاق ایک کھیل ہے، جب جی چاہے کھیلا اور ختم۔ ایسا نہیں ہے۔ یہ مقدس رشتہ ہے جنت میں بھی نیک میاں بیوی ساتھ ساتھ مسندوں پر براجمان ہوں گے۔ دونوں کے ایک دوسرے پر حقوق ہیں۔ ان کو پامال نہ کرو۔ آپ شادی جیسے پاکیزہ بندھن کے امتحان میں بری طرح فیل ہو گئے ہیں۔ لیکن ہمارا رب غفور رحیم بھی ہے۔ ایک دوسرے کو معاف کرو اور اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر جان کر عہد کرو کہ آج کے بعد لڑائی جھگڑا نہیں کرو گے۔ اعتبار کرو گے، عزت کرو گے، ایک بولے تو دوسرا بالکل خاموش ہو جائے۔ حتیٰ کہ اس کا غصہ کافور ہو جائے۔ جب آپ خاموش ہوتے ہیں تو آپ کے ساتھ فرشتہ کھڑا ہوتا ہے جو آپ کی طرف جواب دے رہا ہوتا ہے لیکن جونہی آپ منہ کھولتے ہیں فرشتہ ہٹ جاتا ہے اور اس کی جگہ شیطان آ جاتا ہے۔ وہ کھلا دشمن ہے اس سے بچو۔ اس کا کاری وار میاں بیوی کے نازک رشتے پر ہوتا ہے اور وہ دلوں میں بدگمانی پیدا کرتا ہے۔ اپنے نفس اور شیطان کے شر سے بچیں۔ اپنے ذہن کو بچائیں۔

اپنے جھگڑے کی کوئی خبر گھر والوں کو نہ دیں ان کو صدمہ ہوگا۔ حاسد خوش ہوں گے اور آپ کی صلح ہو بھی گئی تو وہاں بات بڑھ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابی دے۔ صبر، علم، حکمت اور برداشت کی توفیق عطا کرے۔ آپ اچھی زندگی بسر کریں جو دونوں خاندانوں کے لیے مثال بن جائے گا۔ کامیاب ازدواجی زندگی گزارنا جہاد ہے۔ آپ وعدہ کرتے ہیں کہ آپ اس پر عمل کریں گے۔''

’’جی ہم دونوں وعدہ کرتے ہیں۔ جو آپ نے
کہا ہے اس پر لفظ بہ لفظ عمل کریں گے۔‘‘

’’بہت بہت شکریہ، آپ نے میرے الفاظ کی
قدر دانی کی، لاج رکھی۔‘‘

☆☆☆

ہم ہیں صبح امید کے ماتھے کی روشنی!

شب کی دیوی نے اپنا چہرہ پوری طرح سے کھول دیا تھا۔ ہر شے سیاہ حسن کے رعب تلے دب گئی تھی۔

سیاہی ...... جو بدبختی کا استعارہ تھی، شب کی دیوی کا سنگھار تھی۔

بند ماحول، بند کمرے، بند دریچے ...... ہمیشہ سے ہی گھٹن دیتے تھے سوا اس کے کمرے کی سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے دونوں پٹ ہمیشہ ہی وا رہا کرتے تھے۔

پژمردہ چاند کی تھکی تھکی سی چاندنی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اُس کھڑکی میں آ کر پل بھر کو ٹھہرتی تھی۔

ازمیر شاہ، جس کے تخیل کے اڑیل گھوڑے احساس کی دہلیز سے رپٹنے کو تیار کھڑے تھے، چونکتے ہوئے متوجہ ہوا۔

فسردہ سی چاندنی سفید دریچے پہ بکھر بکھر جا رہی تھی۔

''واہ ری شب کی دیوی! یہ تیرے کیل کانٹے ......''

بھرے بھرے ہونٹوں پہ باریک سی مسکان رینگ گئی۔

چاندکی فسوں کاریوں سے کسے انکار ...... وہ بھی کچے دھاگے سے بندھا دریچے میں کھنچا چلا آیا۔

نقرئی کرنوں کے ہمراہ ٹھٹھرتے ہوئے یخ بستہ جھونکوں نے خیر مقدمی انداز میں اُس کے گال تھپتھپائے تھے۔ ماہِ نومبر کی اخیر راتیں تھیں۔ ہلکا ہلکا کہرا تھا جو رات کے اس پہر کوئی چاپ پیدا کیے بنا شب کی راجدھانی میں قدم جما رہا تھا۔

اُس نے غیر محسوس طور پر دونوں ہاتھ سینے پہ باندھ لیے۔ لیدر کی موٹی جیکٹ نے اس کے وجود کی طرح اُس کے ہاتھوں کو بھی گرمائش دی تھی۔

کہرے کی مخصوص مہک کو نتھنوں کے ذریعے اپنے اندر اتارتے ہوئے اس نے ٹھٹھرتی چاندنی کا دلکش رقص اپنی پلکوں پہ محسوس کیا۔

''کبھی شب کی دیوی کے گہنوں پہ غور کیا ہے ازمیر؟''

اس کے کانوں میں دلاور چچا کی مضبوط آواز گونجی تھی۔

''کتنا سج جاتی ہے نا وہ انھیں اپنے وجود پہ سجا کر ......

اور جب کبھی چاند اس کے ماتھے کا جھومر نہیں بنتا، اور تاروں کا گجرا اس کی گھنیری زلفوں کو مہکانے سے انکار کر دیتا ہے تو ہر سو کیسی وحشت سی بکھر جاتی ہے۔ شب کی دیوی کا سارا حسن ماند پڑ جاتا ہے اور گویا وہ اجڑ جاتی ہے۔''

خاموش فضاؤں میں ابھرتی دلاور چچا کی آواز میں واضح اداسی تھی۔

''ازمیر میں غیث ہوں کہ احساس، اُمید اور عزم، حضرت انسان کے گہنے ہیں جو جب تک اس کے وجود کا حصہ بنتے رہیں وہ بہت خوبصورت نظر آتا ہے اور جیسے ہی وہ اُنھیں اتار پھینکتا ہے تو سمجھو جیسے چیخ جاتا ہے، مسخ ہو جاتا ہے۔ بھلا کبھی بے حس، نا امید اور شکست خوردہ انسان بھی کسی کو خوبصورت دکھا ہے؟''

دلاور چچا اور ان کی باتیں ...... وہ ان کی آواز کے سحر میں پوری طرح ڈوب چکا تھا اور ڈوبا رہتا اگر اس کی نظریں سڑک کے دوسری طرف کسی پوسٹ لیمپ کی طرح ایستادہ درخت سے نہ جا لپٹتیں جس کی چھتناری پناہوں میں وہ بالکل یوں سکڑ سمٹ کر لیٹا ہوا تھا جیسے کوئی ننھا بچہ ممتا کی نرم، گرم گود میں جا چھپتا ہے لیکن وہ نرم، گرم نہیں، زمین کی سرد اور سخت گود تھی۔ بوڑھی ہڈیوں پہ لٹھے کی قمیص، جس کی آستینوں سے کہنیوں کے اوپر تک بازو جھانک رہے تھے۔ اس کے علاوہ کھرے کی موٹی چادر تھی، جس نے اس لاغر وجود کو ڈھانپا ہوا تھا ...... چاندنی سب واضح کر رہی تھی۔

درد کی کوئی لہر تھی جس نے اس کی آنکھوں میں بہت سا پانی بھر دیا تھا۔ اگلے ہی پل وہ ہاتھوں میں کمبل لیے اس کے نحیف و نزار جسم کو ڈھانپ رہا تھا۔

دبیز کمبل کی گرماہٹ کا اثر تھا یا اس کے مضبوط ہاتھوں کی نرماہٹ کا، مندی ہوئی آنکھیں ہولے ہولے کھلی تھیں۔ سرد، ویران اور اجاڑ نظروں نے صرف ایک لمحے کو پتھروں کی بستی میں آنے والے اس نو وارد کو دیکھا تھا اور اگلے ہی پل وہ ایک دفعہ پھر سے جھری دار پپوٹوں تلے جا سوئی تھیں۔

''کسی غریب کی کٹیا کو روشن کرتے ہوئے، کسی مفلس کے گھور فاقوں کو دور کرتے ہوئے، کسی یتیم کا تن ڈھانپتے ہوئے اور کسی ضعیف کے ہاتھوں کی لاٹھی بنتے ہوئے کبھی بھی صرف یہ مت سوچنا کہ تم انسانیت کی مدد کر رہے ہو بلکہ ہمیشہ یہ سوچنا کہ تم اپنے ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے کوشاں ہو۔

پاکستان اینٹوں اور سیمنٹ گارے سے بننے والا گھر نہیں ہے۔ یہ وہ گھر ہے جو عزم، ایثار، قربانی اور احساس کی بنیادوں پہ اٹھایا گیا تھا اور اسے پختگی کے لیے بھی انہی سب چیزوں کی ضرورت ہے۔''

دلاور چچا بہت دور رہتے ہوئے بھی، اس کے بہت قریب رہتے تھے۔ ان کی باتیں زادِ راہ کے طور پہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہا کرتی تھیں۔

اُس نے سر اٹھا کر سیاہ آسمان کو دیکھا۔ وہیں کہیں آکاش کے باسیوں میں دلاور چچا کا بھی ٹھکانہ تھا۔

☆......☆......☆

''اوہ، وہ سیبوں کا شاپر تو گاڑی میں ہی رہ گیا ......''

اُس نے ٹھٹھک کر اپنے ساتھ چلتے ہوئے معیز کو مخاطب کیا۔

''دو چابی، میں نکال لاتا ہوں۔''

ازمیر نے ہاتھ میں پکڑا ہوا کی رنگ اس کی طرف بڑھا دیا اور خود ہسپتال کی بلڈنگ کی طرف بڑھ گیا۔ داخلی دروازے کے پاس ہی ایک طرف کوڑا کرکٹ کا چھوٹا سا ڈھیر تھا۔

''ہماری میونسپلٹی کی مہربانیاں ......'' تلخی سے سوچتے ہوئے وہ آگے بڑھنے کو تھا کہ نظریں اس ''زمینی کیڑے'' سے ٹکرا گئیں۔ بنا ہاتھ پاؤں، ٹانگوں اور بازوؤں کے وہ کیا تھا؟ فقط گوشت کا ایک لوتھڑا ...... جو کوڑے کے ڈھیر کے پاس پڑا کوڑا ہی دکھ رہا تھا۔ ایک معذور انسان!

ازمیر کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ وہیں پنجوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا۔ پتھرائی ہوئی آنکھوں میں روشنی نہ ہونے کے برابر تھی۔

''نجانے یہ کیا سوچتا ہوگا، شاید یہ کہ بنانے والے نے اسے بنایا ہی کیوں؟ کیا لوگوں کی ٹھوکریں کھانے کو؟''

خود پہ ضبط کے پہرے بٹھاتے ہوئے اس نے زمین پہ رکھے شاپر میں سے ایک کیلا نکال لیا۔

معیز نے خاصے فاصلے سے اُسے کوڑے کے ڈھیر کے پاس بیٹھے دیکھا تھا۔

''یہ یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے؟''

اُس نے قدرے حیرانی سے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا تھا۔ ازمیر شاہ نے کیلے کا آخری بچ جانے والا ٹکڑا ہاتھوں میں پکڑے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

معیز کی آنکھوں میں اترنے والی حیرت اس کی اوٹ میں لپٹے وجود کو دیکھتے ہی پل بھر میں معدوم ہو ئی تھی۔

ازمیر شاہ نے وہ آخری ٹکڑا بھی اس کے منہ میں ڈال دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

دونوں کوئی بات کیے بنا ہسپتال کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئے جہاں یہ پھل تقسیم کرنے تھے۔

وہ وہاں سے واپس آئے تو ہر سو تاریکی پھیل چکی تھی۔ شب کی دیوی کا سیاہ حسن ہر شے پہ غالب آ چکا تھا۔

''تم کیا سمجھتے ہو، میرے یا تمھارے یہ سب کرنے سے یہ ملک بدل جائے گا؟''

اُس نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے ازمیر کے چہرے پہ نظریں گاڑتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں میں ایسا نہیں مغیث۔ لیکن میں یہ ملک بدلنا ہی کب چاہتا ہوں؟''

''تو پھر کیا مقصد ہے یہ سب کرنے کا؟''

''میں صرف اُن چند لوگوں کے اُن چند لمحوں کو بدلنے کی کوشش کرتا ہوں جو میری دسترس میں ہوتے ہیں۔''

''اس سے کیا ہوا؟ کیا پورا معاشرہ بدل جائے گا؟''

''سکون ملتا ہے مجھے یہ سب کر کے ...... اور معاشرہ بھلے نہ بدلے ...... کسی ایک فرد کی زندگی تو بدلتی ہے نا......دیکھو، میں بہت معمولی سا آدمی ہوں۔ ملک یا قوم کے بدلنے کی بات نہیں کرتا۔ میں فردِ واحد کی تبدیلی پہ یقین رکھتا ہوں اور معاشرہ انہی افراد سے مل کر بنتا ہے۔''

''تاریکی بہت ہے ازمیر ...... بہت اندھیرا ہے۔''

معیز نے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے مایوسی سے کہا۔ ہر شے سیاہی میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''جانتے ہو دلاور چچا کیا کہا کرتے تھے؟'' اس نے ایک لمحے کو توقف کیا۔

’’کہتے تھے کہ ’’سیاہی ...... جو بدبختی کا استعارہ ہے ، شب کی دیوی کا سنگھار ہے۔ تاریکی ...... جو مایوسی کا ہرکارہ ہے عزم و ہمت کے جنگجو کے لیے عمل کا میدان ہے ...... تیرگی دکھے گی تو اجالوں سے پیار کرنے والا اس کا سینہ چیرنے میں جت جائے گا۔

’’اور یقین کرو معیز مجھے اجالوں سے بہت محبت ہے۔ سو میں ایک جگنو کی طرح اپنی پیٹھ پہ عمل کا ایک ننھا سا دیا جلائے سرگرداں پھرتا ہوں یہ تیرگی کو ختم تو نہیں کر پاتا لیکن گھٹا ضرور دیتا ہے۔‘‘

معیز انعام نے ایک تفاخر کے عالم میں اپنے جگری یار کا کندھا تھپتھپایا۔ بے شک ایسی مثبت سوچ رکھنے والے انسان کی دوستی اس کے لیے کسی سرمائے سے کم نہ تھی۔

شب کی دیوی بھی اپنے عاشق کے فلسفے پر مسکرا دی، وہ فلسفہ جو اندھیاروں کا قاتل تھا۔

☆☆☆

کہیں چاند راہوں میں کھو گیا

وہ جو تسبیح کے دانوں پر محرومیوں کا شکوہ پڑھتا تھا، جب اس کی فریاد سنی گئی تو وہ ٹھٹکا اٹھا......تشکیک کی سرحدوں پر گھومتے ایک انجان کی کہانی

عمر خیام کے دل میں اس کے لیے عزت اور لہجے میں محبت تھی۔

پھر جتنے دن اشہد ہسپتال میں رہا۔ ابوذر وقتاً فوقتاً عمر خیام اور اس کی فیملی سے رابطے میں رہا۔ وہ ڈاکٹر تھا، ایسا ڈاکٹر جو جانتا تھا جسمانی عارضوں کے سرے بہت سے کیسز میں روحانی مرض سے جڑے ہوئے ہیں۔ روح کو، قلب کو طاقتور بنادو، جسم خود بخود توانا ہو جاتا ہے۔ پیغمبرؐ کا فرمان بھی تو ہے۔ ''اے لوگو! تمہارے جسم میں ایک عضو دل ہے اس کو درست رکھو گے تو سارا جسم درست رہے گا۔''

ابوذر بھی ہارٹ سپیشلسٹ تھا، اپنے مریضوں کو بیماری کی جڑ سے آگاہ کرتے ہوئے ان کو اصل فساد کی بنیاد سے بھی آگاہی دیتا۔ جسم اور روح کی طاقت ہی سے اصل طاقت ملتی ہے۔ ورنہ عمدہ سے عمدہ علاج اور ماہر طبیب بھی بیکار رہتا ہے۔ اشہد کی کسی رپورٹ میں کوئی بھی منفی پہلو نہ آیا تھا۔ پھر وہ خود بخود کھڑے کھڑے کیسے گرا اور بے ہوش ہونے کے بعد اسے ہوش میں آنے میں چوبیس شمیمہ کیوں لگ گئے، یہ بتانے سے مہیا کردہ رپورٹس عاجز تھیں۔

''اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ آئندہ کبھی ایسا نہ ہوگا۔ کب اور کہاں ایسا ہو جائے کوئی کچھ نہیں بتا سکتا۔'' ڈاکٹر کے الفاظ عمر خیام کے کانوں میں گونجتے تو وہ ٹھٹکا جاتا۔

''ساری آزمائشیں میرے ہی لیے کیوں ہیں۔ انعمت اور اب اشہد۔'' بے حد مضبوط، عمر خیام اولاد کے معاملہ میں بالکل ہی موم تھا۔ اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ دنیا میں ملی ساری کامیابیاں اور تمغے اس دکھ کے آگے عمر خیام کو بے وقعت لگنے لگے تھے۔ خوبصورت، تندرست سا اشہد اس واقعہ کے بعد سے جیسے کمھلا سا گیا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسے حادثہ سے قبل لیکن اس کے چہرے کی چمک اور آنکھوں کے جگنو ماند سے پڑ گئے تھے۔ پڑھائی میں بھی اس کا وہ معیار برقرار نہ رہ پایا تھا جو ہمیشہ سے تھا۔ بظاہر سب کچھ ہی نارمل تھا۔ عمر خیام نے کام کے بعد کا تمام وقت گھر میں گزارنا شروع کر دیا تھا۔

سحاب کہیں بہت دور چلی گئی تھی۔ کتنے ہی بار وہ دن میں رابطہ کی کوشش کرتی مگر ہمیشہ ہی ناکام رہتی۔ ملاقات کرنا چاہتی مگر عمر خیام نے اسے اتنی اجنبی نگاہوں سے دیکھا کہ وہ خود ہی لوٹ گئی۔

انعمت کی وہی کیفیت تھی اور تہمینہ کا اس کے ساتھ وقت کھپانا بھی اسی طرح تھا۔ وہ مزید کمزور ہو چکی تھی۔ اشہد میں بھی اس کی جان اٹکی تھی۔ اسکول جاتا تو اسے یہ ہی فکر رہتی کہ سب خیریت ہو کہیں وہ گر نہ جائے، اور اگر ایسی جگہ گرا جہاں کوئی نہ ہوا یا کوئی اور حادثہ......

اس دن عمر خیام کمرے میں بیٹھا اپنے لیپ ٹاپ پر فوٹوگرافی کے حوالے سے ہی کچھ کام کر رہا تھا۔ بین الاقوامی مقابلہ کے چیندہ دس فوٹوگرافرز کا اعلان ہونے میں ہفتہ بھر باقی تھا۔ وہ اپنا نام ان بہترین کی فہرست میں دیکھنے کے لیے بہت پرامید تھا۔ رات گیارہ بج رہے تھے۔ تہمینہ انعمت کے پاس سے ابھی تک آئی نہیں تھی۔ کچھ دیر قبل مددگار لڑکی جو انعمت کے لیے رکھی گئی تھی، آئی تھی کہ وہ ضد کر رہی ہے ممی کو بلاؤ۔ اب کم از کم رات کو ماں آرام سے کچھ شمیمہ سو جاتی تھی۔ چار، پانچ شمیمہ......اس سے زیادہ وقت اس کو نہ ملتا تھا۔ کبھی بھی کسی بھی بات پر ایسا مسئلہ ہو جاتا کہ وہ مددگار لڑکی کے بس سے باہر ہوتا اور وہ میڈم جی کو ہی انی کے لیے بلاتی۔

کام ختم کر کے عمر خیام نے ایک تصویر کھولی۔ یہ چھ برس قبل کی تصویر تھی جب انعمت پیدا ہوئی تھی۔ آٹھ برس کا ارحم اور چھ برس کا اشہد خوش باش ماں باپ اور تہمی کی گود میں لیمن رنگ کے کمبل میں لپٹی گڑیا سی بیٹی۔ زندگی کی رعنائیاں اپنے جوبن پر تھیں۔ بے اختیار عمر خیام نے اپنے بچوں اور بیوی کی تصویر پر انگلی کی پور پھیری۔ اسے ان پوروں میں جذبات امنڈتے محسوس ہو رہے تھے۔ LCD اس کی پور کے ہلکے دباؤ سے بھی تصویر کو اس جگہ سے سیکنڈ کے لیے مدھم کر دیتا جہاں انگلی رکھی جاتی۔ ''یہ کام چھوڑ دے بیٹا اللہ کے نبیؐ کی حدیث کہتی ہے کہ قیامت کے دن تصویر بنانے والے کو اس میں جان ڈالنی پڑے گی۔'' عمر خیام نے بے ساختہ چونک کر ارد گرد دیکھا۔ اسے لگا جیسے بابا جان لمحہ بھر قبل اسکے پاس کھڑے اس سے سرگوشی کر رہے تھے۔ ان کے عطر کی مخصوص خوشبو جو ہمیشہ ان کے پاس سے اٹھا کرتی تھی عمر خیام کو بہ خوبی محسوس ہو رہی تھی۔ ''میرے بچوں میں سے جان قیامت سے پہلے ہی نکل رہی ہے بابا جان۔'' اس نے رندھی آواز میں سرگوشی سی کی۔ ''پہلے انعمت اور اب اشہد۔''

وہ بظاہر خود کلامی کر رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتی تہمینہ نے حیرانی سے اس کو اپنے آپ سے باتیں کرتے دیکھا۔ وہ نہایت خاموشی سے بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔ عمر خیام اتنا مگن تھا کہ اسے بیوی کی آمد کا بھی احساس نہ تھا۔ ''کچھ نہیں ہوگا تمہارے جگر کے ٹکڑوں کو، ان کو وہ رزق کھلاؤ جو بابرکت ہو۔''

''بابا جان!'' عمر خیام بے اختیار بستر سے اتر آیا۔ بابا جان کی خوشبو غائب ہو چکی تھی اور اس کی آنکھیں نم۔ تہمینہ نے الجھی نگاہوں سے اسے دیکھا تو جو اپنے مرحوم باپ کو پکارتے ہوئے بستر سے اتر رہا تھا۔ ''کیا ہوا؟'' اس نے نرمی سے شوہر کا ہاتھ تھاما جو ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ وہ اس کو بازو سے تھامتی بستر پر بیٹھ گئی۔

''ابھی بابا جان آئے تھے، کہہ رہے تھے ہمارے بچوں کو کچھ نہیں ہوگا اگر ہم بابرکت رزق کھلائیں۔ کیا مطلب اس کا تمہی؟ میں کیا انہیں حرام نہیں کھلا رہا ہوں۔ اللہ کی قسم میں نے کبھی کسی کا حق جان بوجھ کر نہیں مارا، کوئی دھوکا کبھی نہیں کیا۔ پھر میرا رزق بابرکت کیسے نہیں؟'' وہ غمگین آواز میں اتنے آہستہ سے بات کر رہا تھا کہ تہمینہ بمشکل ہی سن پائی۔

''عمر جتنی محبت ہم ماں باپ اپنے بچوں سے کرتے ہیں، ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ ہمارا خالق ہم سے اس سے کہیں زیادہ محبت کرتا ہے۔'' اس نے پرسوز آواز میں اسے یقین دلانا چاہا۔ وہ جس وقت کمرے میں داخل ہوئی نیند سے اس کی آنکھیں اور تھکان سے اس کا جسم شل ہو رہا تھا لیکن اب وہ پوری لگن سے میاں کو تسلی دے رہی تھی۔ حالانکہ عرصے سے اس نے عمر خیام سے بلاضرورت بات کرنی بند کر دی تھی۔ باہر سے آئے قصے اس کو عمر خیام کے حوالے سے غمگین کرتے رہتے تھے۔ لیکن گھر میں ایک نیا محاذ کھولنا اس کے بس میں نہ تھا۔ انعمت کے ساتھ وہ اپنی توانائیاں خرچ کر دیتی تھی اور اس بات کا بھی بخوبی احساس تھا کہ اس کا، عمر خیام کا اور دونوں بیٹوں کا تعلق ظاہری طور پر بہت کم ہو چکا ہے۔ بچے اب اسے انعمت کی ممی کہہ چکے تھے تو عمر خیام کے لئے بھی وہ یقیناً صرف بچوں کی ماں ہی رہ گئی ہے۔ بیوی کا کردار تو گم ہی ہوتا جا رہا تھا۔ ایسے میں عمر خیام کے بارے میں سنی باتیں دلخراش بے شک تھیں مگر وہ خاموش تھی۔ بس دعاؤں میں مزید عاجزی آ چکی تھی۔ عمر سے دوری کا احساس ہونے لگا تھا۔

انسان بس ایک حد تک ہی انسان سے محبت

کر سکتا ہے، اسکی اپنی ضروریات، اپنی محتاجیاں ہیں۔ وہ آہ بھر کر سوچتی مگر عمر خیام سے دل میں ناراضگی اور غصہ نہ مٹا سکی جو فطری تھا۔ وہ بھی انسان تھی نہ جانے کتنی بھی حقیقت پسندی سے سوچتی مگر دل کے جذبات عمر کے لیے سرد ہوتے چلے گئے۔ اولاد عمر کی بھی ہے، اسی کی دیکھ بھال نے مجھے مصروف کیا تو عمر نے مجھے زندگی میں سے ہی کھسکانا شروع کر دیا۔ وہ سسکتی رب سے ضرور شکوہ کرتی، اس وقت وجوہات، نفسیات، ضروریات کے فلسفہ کے بجائے دل حاوی ہوتا۔

اس تمام تر گلے کے باوجود وہ جس وقت عمر کو تسلی دے رہی تھی تو جیسے پرانے سارے شکوے غائب ہو گئے تھے۔ اس کی بچوں کے لیے فکر، آزردگی نے یکدم اسے وہی تہمینہ کر دیا تھا جو عمر خیام کی ہمیشہ سے غمگسار رہی تھی۔ عمر خیام نے رب کی بندوں سے محبت کی بات سن کر اتنی خالی نظروں سے بیوی کو دیکھا کہ اسے لگا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

''اگر وہ محبت کرتا ہے تو دکھ کیوں دیتا ہے۔ کیا یہ ظلم نہیں؟'' اس کی آواز میں بہت تھکان تھی۔

تہمینہ نے نرمی سے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر ان میں بوسے ثبت کیے اور دھیرے سے بولی ''دکھ ہی انسانوں کو انسان بناتا ہے۔''

عمر خیام نے بے یقینی سے اس کی آنکھوں میں دیکھا جہاں بے شمار شکوے تیر رہے تھے، اپنے ہاتھوں کو دیکھا جو بدستور اس کے ہاتھوں میں تھے۔ ''تہمی تم کہاں چلی گئی تھیں؟'' وہ اسکے سحر میں آ چکا تھا۔

سحاب نے اپنی سی کوشش کر لی تھی لیکن عمر خیام نے جیسے اس سے ہر تعلق توڑ لیا تھا۔ یہ نہ تھا کہ وہ اس کو بھلا چکا، بس خوب اچھی طرح یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ اس نے اس وقت ''نہ'' کر کے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ عمر خیام اس کو بیوی ہی بنا کر رکھنا چاہتا تھا مگر گاڑی کی اسٹپنی کی طرح جو بوقت ضرورت کام دے۔ اس کے ماں باپ کو راضی کرنے کے بکھیڑوں میں پڑنا نہ چاہتا تھا۔ سحاب نے اس دوران اپنے والدین سے بات کرنے کی کوشش بھی کی تو انکار ردعمل متوقع ہی تھا۔ ان کو بیٹی کی جذباتیت اور نادانی پر خوب غصہ اور افسوس تھا۔

''آپ نے اور ڈیڈی نے بھی تو پسند کی شادی کی تھی پھر میرے لیے یہ پابندی کیوں؟'' اس نے ماں باپ کے واضح انکار کے بعد ماں کو راضی کرنے کے لیے ان کی زندگی سے ہی دلیل دینی چاہی تو وہ چپ رہ گئیں۔

''میرا معیار تو تمہارے باپ جیسا شاندار جوڑ تھا......تمہارا معیار بھی ایسا ہوتا تو ہم کبھی اعتراض نہ کرتے۔'' کچھ دیر بعد اس کو گھورتے ہوئے انہوں نے آگ بھرے لہجے میں کہا اور بیٹی کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہاں سے ہٹ گئیں۔

جس نے اپنی عمر کے بیس سال اس طرح گزارے تھے کہ نہ کوئی بہن بھائی اور نہ کوئی کزن...... نہ ماں کی طرف سے اور نہ باپ کی طرف سے...... باپ کے خاندان والوں نے اپنے بیٹے کو تو قبول کر لیا تھا مگر اس کی بیوی اور بیٹی کے لیے اس گھر کے دروازے اب بھی بند تھے۔ سحاب کی ماں اپنا کیریر بنانا چاہتی تھیں۔ سو دونوں میاں بیوی نے نظریہ ضرورت کے تحت ایک بچہ زندگی کے لیے بہت جانا۔ ان کی ضرورت تو بلاشبہ پوری ہوگئی لیکن تنہا بچہ کن تشنگیوں میں پلا، اس کی خبر ان کو کچھ نہ ہوئی۔ بیس برس کی سحاب بیالیس برس کے عمر خیام کے لیے ہر مشکل سہنے کے لیے تیار ہو جائے، اس میں دخل ان جذباتی محرومیوں کا تھا جو اس کے اندر پنپ چکی تھیں۔ انسان کے بچوں اور جانوروں کے بچوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ جانور ماں اکیلی پالتی ہے۔ اپنی تمام تر ممتا نچھاور کرتی ہے مگر جیسے یہ بچے اپنے لیے غذا کی فراہمی کے قابل ہو جاتے ہیں وہیں راستے جدا جدا ہو جاتے ہیں۔ کون جانے کون ماں اور کون بچے۔ اپنی غذا کی فراہمی میں بھی مختصر ترین عرصہ ہی لگتا ہے اور جو ہر نوع کا علیحدہ ہے۔ لیکن خالق کائنات نے انسان اور اس کی اولاد کے درمیان اٹوٹ تعلق دنیا کی ابتدا سے لے کر جزا وسزا والے دن تک کا رکھ دیا ہے۔ تمام تر خوبصورت جذبے اس سے منسلک کر دیے۔ ایسے میں انسان جانور ماں کی طرح اپنے بچوں کو محض اس لیے تنہا چھوڑ دیں کہ ان میں خود اعتمادی اور مضبوطی پروان چڑھے گی تو محض مفروضہ ہے۔ انسان کے بچے کو ہر عمر میں جذباتی سہارے درکار ہوتے ہیں چاہے وہ خود ماں باپ بن جائے۔ سحاب کی ماں نے بھی سحاب کے تین سال ہونے تک اپنے آپ کو سحاب کے لیے وقف رکھا تھا۔ چوتھی سالگرہ پر ماں باپ ملازمت سے واپسی پر اس کو نانا نانی کے گھر سے پک کرتے ہوئے کھلونوں کی دکان پر لے گئے تھے، جہاں سے انہوں نے اسے قیمتی کھلونا دلوایا تھا، جسے خرید کر ماں باپ اور بچی دونوں ہی خوش نظر آرہے تھے۔ گھر جا کر ماما، ڈیڈی نے پورا ایک گھنٹہ سحاب کے ساتھ گزارا، پھر دن بھر جاب کے بعد کی تھکان اتارنے کے لیے اس کو خوب بوسے دے کر ادھر ادھر

ہوگئے۔ ماما کو تو گھر کے بچے کھچے کام بھی کرنے ہوتے تھے۔ وہ تو بہت مصروف رہتی تھیں۔ جب بھی سحاب ان کو پکارتی وہ جسٹ اے منٹ کہتیں اور پھر کبھی کچن تو کبھی صفائی میں مصروف ہو جاتیں۔

اس کے بعد اس کے حصے میں ماں باپ کے بقول ''عمدہ ترین ایک گھنٹہ'' ضرور آتا تھا اور بس۔

ہوم ورک نانا یا پھر نانی کرا کر بھیجا کرتے تھے۔ پانچویں چھٹی تک سحاب کا کام بہ آسانی ان کی مدد سے ہو جاتا تھا پھر اس نے خود ہی کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ جوان لوگوں کی نسبت ادھیڑ عمر کے لوگوں سے زیادہ انسیت محسوس کرتی جو اس سے بہت زیادہ شفقت دکھاتے تھے۔ جب تک ماں باپ سے اس نے عمر خیام کے بارے میں بات نہ کی تھی اس وقت تک اس نے اپنے طور پر اچھی اور ذمہ دار اولاد کا مان رکھتے ہوئے نکاح سے انکار کر دیا تھا۔ اسی مان نے اسے خفیہ نکاح کے تاریک گوشے بھی خوب واضح کر دیے تھے۔ لیکن اب جب انہوں نے انکار کر دیا تھا تو اس کا دل عمر خیام کے بغیر زندگی ادھوری دکھا رہا تھا اور ماں باپ کو اس کی خوشیوں سے بے نیاز۔

پندرہ دن گزر چکے تھے اس ستمگر نے کسی بھی رابطے کی پذیرائی نہ کی تھی۔ اس کی اتنی بے نیازی پر سحاب کو زندگی خوب ویران لگنے لگی تھی۔ بالآخر اس نے جو میسج کیا اسے پڑھ کر عمر خیام دھیرے سے مسکرا دیا۔

وہ اس وقت اپنے اسٹوڈیو میں بیٹھا چائے اور سینڈوچ کھا رہا تھا۔ آج صبح وہ تہمینہ کے ساتھ ناشتہ کی ٹیبل پر بیٹھا اپنے بھیجے گئے پورٹ فولیو پر گفتگو کر رہا تھا۔ وہ دھانی رنگ کے سوٹ میں بہت اچھی لگ رہی تھی۔ مدت بعد اس کا ڈھیلا سا جوڑا اس کی گردن پر ڈھلکا تھا۔ بچے اسکول جا چکے تھے۔ انعمت مددگار لڑکی کے ساتھی تھی۔ عمر خیام میں بھی جیسے شوخی آ چکی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسکے جوڑے کے پن نکال دیے اور بالوں کے لہریے تہمینہ کی کمر پر پھیلے تو وہ بے اختیار کھِل کھلا اٹھی۔

بس یہ سب کچھ دو منٹ ہی کی بات تھی اور پھر کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی جیسے کانچ پھیلے ہوں۔

''یا اللہ رحم! تہمینہ کا چہرہ پھیکا پڑ گیا اور وہ بھاگتی ہوئی آواز کے رخ پر گئی تھی۔ عمر خیام نے بھی پیچھے جا کر دیکھا، منظر حیران کن بھی تھا اور اشتعال دلانے والا بھی۔ انعمت کے لیے رکھی گئی مددگار لڑکی بھاگتی ہوئی اس کے اور تہمینہ کے بیڈروم سے نکلتی ہوئی گھر سے نکل رہی

تھی۔اور کمرے میں الماریوں کے پٹ کھلے تھے جیسے ان کی تلاشی لی گئی ہو۔انعمت ایک طرف سہمی کھڑی تھی۔ مسہری کے سرہانے رکھی میز پر سجا کرسٹل کا لیمپ چکنا چور ہو چکا تھا۔عمر خیام نے تیزی سے آگے بڑھ کر بیٹی کو کرچیوں کے پاس سے اٹھایا اور باہر آ گیا۔ناشتہ اس کا اور تہمینہ کا ایسے ہی رہ گیا۔ہنستے مسکراتے لمحات کی عمر بھی بس دو منٹ رہی اور پھر عمر خیام جس وقت گھر سے نکلا تو تہمینہ انعمت کے ساتھ مصروف ہوچکی تھی، ہمیشہ کی طرح۔نہ جانے عمر خیام کو سحاب اس وقت پوری شدت سے یاد کیوں آئی۔شاید وہ لمحات جو وہ تہمینہ کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔وہ دل میں کسک دے رہے تھے۔وہ ہونٹ بھینچتا ہوا خارجی دروازے کی طر بڑھ گیا۔نہ جانے عمر نے ناشتہ بھی کیا ہے یا نہیں؟ لمحہ بھر کے لیے تہمینہ کے دل میں خیال ابھرا، بہت عرصہ بعد تو کچھ دنوں سے عمر خیام اسے پہلے کی طرح گھر میں چلتا پھرتا دکھائی دیا تھا۔ورنہ دو سال سے اس نے گھر سے باہر وقت گزارنا شروع کر دیا تھا۔بے شک وہ بھی اسکی موجودگی کے باوجود اس کو وقت نہ دے پائی تھی مگر عمر کا موجود ہونا بھی ایسا تھا جیسے طوفانی بارش میں وہ رین کوٹ اور لانگ بوٹ پہنے کام میں مصروف ہو۔اب جب وہ نہ ہوتا تھا تو بارش کی شدت تو وہی تھی لیکن اسے اپنا آپ اکثر بکھیکا تا ہوا لگتا۔کبھی کبھی اپنے میاں اور بیٹوں کے ساتھ اپنا تعلق اسے اس ریت کی طرح لگتا جو اس کے ہاتھ سے پھسلتی جا رہی ہو۔وہ بند مٹھی کے باوجود اس کو گرنے کو نہ روک پا رہی ہو۔ایسے میں دعا کے لیے اس کے پھیلے ہاتھ میں آنکھوں سے خوب ٹوٹ کر آنسو گرتے اور انعمت کی صحت کے بجائے دل میں نحیف سی آواز ابھرتی ''یا ارحم الرحمٰن تو نے ہی یہ نعمت دی تھی، تو ہی اس کو واپس لے لے، میں چھ سال میں بہت تھک چکی ہوں، اب میرے بس سے باہر ہے، میرا شوہر، میرے بیٹے مجھے لوٹا دے۔ میرے رب!''

بیٹی کی زندگی کے بجائے اس کی موت کی دعا مانگتے اس کا کلیجہ بکھیکا سا جاتا لیکن بند ہونٹ سے ادا لفظ اور آنسو کی دھاریں پھیلے ہوئے ہاتھوں پر گرتیں اور وہ دعا کے بعد دل میں اتری سکنیت کے سہارے پھر اپنی ذمہ داریوں کے میدان میں اتر جاتی۔کبھی اسے لگتا کوئی ایسا معجزہ ہوگا کہ انعمت بالکل صحت مند ہوجائے گی کبھی وہ سوچتی شاید اس میں اتنی توانائی آ جائے کہ وہ اس ابنارمل اولاد کی ذمہ داریوں کے ساتھ دوسرے معمولات اسی طرح چلائے جیسے ہمیشہ

سے کرتی آئی تھی۔

ان دونوں میں کچھ بھی نہ ہوا الٹا اشہد اس کا ذہین اور خوبصورت بیٹا خزاں رسیدہ پتے کی طرح لگنے لگا۔ تہمینہ کے لیے زندگی کے خوش نما رنگوں میں مزید کمی ہوگئی۔ جب سے عمر خیام نے ''بابرکت رزق'' کا ذکر کیا تھا اپنے والد کی ہدایت کے حوالے سے وہ مضطرب ہو چکی تھی۔ کیا عمر خیام اپنا ذریعہ معاش بدل لیں تو ہمارے گھر اترتی یہ اداسیاں، خوشیوں میں بدل سکتی ہیں؟ اس کے ذہن میں شدت سے سوال ابھرتا، لیکن عمر خیام سے اس موضوع پر بات کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔ وہ جانتی تھی کہ فوٹوگرافی اس کا عشق ہے۔ اور وہ اس کی اس بات پر یقین بھی نہیں کرے گا، لیکن اپنے نیک طبیعت سسر کی بات نے اپنے بچوں کی صحت کے حوالے سے اس کو بے چین کر رکھا تھا۔ اسے یہ بھی حیرانی تھی کہ کیا عمر نے جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھا تھا۔ کیا ایسا ہونا ممکن ہے کہ کوئی دنیا سے جانے والا اس طرح نصیحت کرنے آئے؟ اور اگر ایسا ہوا بھی تو کاش وہ عمر خیام کو اپنی روش بدلنے کی ہدایت بھی کرتے۔ جو رب سے اسے دور کر چکی ہے۔ عبادت میں اس کی بے اعتنائیاں، منعم سے اس کی بے التفاتیاں، رزاق سے اس کی ناشکریاں تہمینہ کو پریشان رکھتی تھیں۔ وہ ایسا تو نہ تھا کہ ولی ہوتا لیکن رب سے اتنا دور نہ تھا، جتنا اب ہو چکا تھا، تہمینہ خود بھی صوفی منش تو نہ تھی لیکن بنیادی عقائد اس کے بڑے مضبوط تھے جن پر تمام اعمال کا دارومدار ہوتا ہے۔

شب و روز گزر رہے تھے۔ عمر خیام اور سحاب کے تعلقات دوبارہ استوار ہو چکے تھے۔ اب سحاب اس سے خفیہ نکاح پر بھی راضی تھی مگر اشہد کے واقعہ کے بعد عمر خیام اپنے لیے ذمہ داری کا کوئی نیا میدان نہیں کھولنا چاہ رہا تھا۔ وہ بیٹوں کے ساتھ بھی بھرپور وقت گزارتا تھا۔ جو دوسری شادی کے بعد کم ہو جاتا۔ سحاب کے والدین تندہی سے اس کے لیے اپنے معیار کا رشتہ تلاش کرنے میں مصروف تھے۔ سحاب ان کی منشا جانتی تھی اس لیے ہی عمر خیام سے اشاروں کنایوں میں کتنی بار ہی اس سے نکاح کے لیے رضامندی دکھا چکی تھی مگر وہ اس پر کوئی توجہ نہ دیتا۔ ''ایسے ہی رکھ لے، شادی کی کیا ضرورت ہے۔'' جملہ جو اس کے دوست نے سحاب کے لیے کہا تھا۔ عمر خیام کے کانوں میں گونجتا اور اپنے ساتھ جڑے مسائل ذہن میں ابھرتے تو اسے سحاب کے ساتھ بغیر ذمہ داریوں کے طوق کے وقت گزارنا ہی آسان لگنے لگا۔ شکر ہے اس نے منع کر دیا، وہ دل ہی دل میں سحاب کے اس دن نکاح پر رضامند نہ ہونے پر

شکریہ بھی کہتا اور شہد آگیں لہجے میں باتیں کرتا ہوا ساحل سمندر کی ریت پر چلتا رہتا، جہاں دونوں کے قدموں کے نشان ساتھ ساتھ بنتے اور کچھ دیر بعد مٹ جاتے، سحاب ان نشانوں کو پلٹ کر دیکھتی کہ یہ کب تک ساتھ رہیں گے، کچھ دیر بعد پانی کی لہر ان کو مٹادے گی۔ تب اس کا دل عمر خیام سے بغاوت کو چاہتا مگر اس کے ہاتھوں پر عمر خیام کے ہاتھوں کا دباؤ اسے پھر اس کی جانب ملتفت کر دیتا عمر خیام ہمیشہ ہاتھ پکڑ کر ساحل پر چلتا تھا۔

اشہد اتنی دیکھ بھال کے باوجود اپنی پرانی جون میں لوٹ کر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے لیے عمر خیام نے اسی ڈاکٹر سے ملنے کے لیے وقت لیا تھا جس نے حادثہ کے بعد اشہد کا علاج کیا تھا، ہاسپٹل پہنچ کر علم ہوا کہ کچھ ایمرجنسی ہوگئی ہے جس کی بنا پر ڈاکٹر وقت سے پہلے چلے گئے ہیں، اس لیے اب اسے اگلے دن آنا ہوگا۔ خوب کوفت کے ساتھ واپسی کے ارادے سے پلٹا ہی تھا کہ سامنے سے بورڈ پر ڈاکٹرز کے نام کے ساتھ ڈاکٹر ابوذر کا نام پڑھ کر ٹھٹک گیا، جیب سے سیل فون نکال کر اس نے ابوذر کا دیا ہوا نمبر ڈائل کر دیا۔ وہ ایسا کس ارادے سے کر رہا تھا، خود بھی لاعلم تھا۔ لیکن دل میں بے اختیار ابوذر سے ملاقات کی خواہش ابھری تھی۔

بیل جا رہی تھی۔ جلدی ابوذر نے ریسیو کرلیا۔ ''جی عمر خیام صاحب کیسے یاد آئی ہماری؟'' سلام جواب کے بعد پہلا جملہ اس نے بڑی شگفتگی سے کہا۔

''آپ دل کے مسیحا ہیں اور آپ کی یاد دل کی لگی کے حوالے ہی سے آئی۔'' اس نے برجستگی سے ہنستے ہوئے جملہ کہا تو ابوذر کا دھیما سا قہقہہ ابھرا۔ ایسی ہی کچھ دو چار باتوں کے بعد اس نے ابوذر سے ملاقات کے لیے وقت لینا چاہا جہاں وہ اس سے غیر رسمی باتیں کر سکے تو اسکی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس طرح یہ بات کہے، ابوذر سے اس کی آشنائی تھی، دوستی نہ تھی کہ وہ کسی یار دوست کی طرح اس سے بات کر سکتا۔

''میرے اسٹوڈیو کی نئی برانچ کا افتتاح ہے اور ایک چھوٹی سی دعوت۔ اگر آپ اپنی فیملی کے ساتھ اس میں شریک ہوں تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔'' عمر خیام کو اچانک سوجھا مگر اس نے معذرت کر لی۔

''عمر خیام صاحب آپ کی دعوت تو نہ کھا سکیں گے لیکن آپ سے خدمت ضرور لیں گے۔ کچھ پاسپورٹ فوٹوز چاہئیں، ان کے لیے آپ کے اسٹوڈیو آؤں گا۔'' ابوذر نے شائستگی سے پہلو بچایا تو عمر خیام نے اطمینان

محسوس کیا اور کال ختم کر کے ایس ایم ایس کر کے اپنا ایڈریس بھیج دیا۔

دن گزر گئے، عمر خیام منتظر ہی رہا لیکن شاید ابوذر کو وقت نہ مل سکا یا کچھ اور وجہ تھی۔ اس کا آنا ہی نہ ہوسکا۔ مقابلے کے نتائج کا اعلان بھی اس دوران ہوگیا۔ عمر خیام کو دلی صدمہ ہوا جب فوٹو گرافی کے اس عالمی مقابلے کے کامیاب ناموں میں اس کو اپنا نام نہیں ملا۔ وہ ٹاپ ٹین میں بھی نہ تھا۔ نہ بہترین تیس میں، ہاں اس کو اگلے تین برس بعد ہونے والے مقابلے کے لیے خصوصی دعوت نامہ دیا گیا تھا۔ جو مخصوص فوٹو گرافراز کو روانہ کیا گیا تھا۔ مقابلے میں ناکامی نے اس کو نہایت ہی دل شکستہ کر دیا تھا۔ یہ ناکامی نہ تھی، عمر خیام کے لیے سانحہ تھی۔ اور سانحات کچھ لوگوں کو رب کے قریب لاتے ہیں کچھ کو دور کر دیتے ہیں۔ عمر خیام کو لگا خدا اس کو ہر طرف سے سزا دینا چاہتا ہے۔ ہر چیز میں ناکام کرنا چاہتا ہے۔ اسے اپنی طاقت اور قوت سے عمر خیام کو دکھی دیکھنا ہی پسند ہے۔

''میں تجھ سے مقابلہ نہیں کر سکتا رب لیکن تجھ سے محبت کی بنیاد بھی میرے پاس نہیں۔'' کمپیوٹر سکرین پر مقابلے کے نتائج دیکھتے ہوئے وہ نہایت آزردہ تھا۔ وہ اس وقت کسی انسان سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہ رہا تھا۔ کوئی رشتہ، کوئی ناطہ اس کو یاد نہ آ رہا تھا، بس اس ناکامی نے جیسے اس کی حسیات کو فی الحال سن کر دیا تھا۔ اسٹوڈیو میں بنائے اپنے ذاتی آفس میں وہ پچھلے گھنٹہ بھر سے ایک ہی زاویہ پر بیٹھا سوچوں میں گم تھا۔ کس نے دستک دی، کہیں نے فون کیا اسے احساس ہی نہ تھا، نگاہ میں ایسے ہی سامنے دھرے سیل فون پر چلی گئی جو جل بجھ رہا تھا۔ رنگ ٹون اس کی سماعت میں نہ پہنچ رہی تھی، ایسا نہ تھا کہ بج نہ رہی تھی لیکن دماغ اس کو پہچان نہ پایا تھا۔ غائب دماغی کے ساتھ اس نے ہاتھ بڑھا کر فون ریسیو کرلیا۔ دوسری طرف کون تھا، کیا کہہ رہا تھا کچھ بھی وہ نہ سن رہا تھا۔ وہ سننا ہی نہ چاہتا تھا۔ فوراً ہی کال منقطع اگلی طرف سے کر دی گئی۔ اس نے اسی کیفیت میں مس کال کے ساتھ آیا نام سکرین پر پڑھا۔ ''ابوذر!'' زیرلب دہراتے ہوئے اس نے بٹن دبا کر ابوذر کو فون ملا لیا۔ اسے لگا جیسے اس وقت اسے ابوذر سے ملنے کی شدید ضرورت ہے دوسری طرف سے فون اٹھایا گیا تو اس نے کوشش سے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بات شروع کی۔

''میں دس منٹ میں آپ کے پاس آ رہا ہوں،

فوٹوز وغیرہ کا کام ہے، ویسے یہ کام آپ کی غیر موجودگی میں بھی ہوسکتا ہے لیکن ملاقات ہو جائے تو کیا ہی عمدہ بات ہو۔''ابوذر نے ہمیشہ کی طرح اپنائیت سے بات کی ہمیشہ کی طرح ہی وہ جلدی میں تھا۔مختصر سا میسج دے کر ابوذر نے فون ختم کر دیا تھا۔عمر خیام خدا سے ناراض تھا، لیکن جو خدا سے محبت رکھتا تھا وہ اس سے ملاقات کا متمنی تھا، اسے لگتا تھا، جیسے ابوذر سے نکلنے والی لہریں اسے پرسکون کر دینگی۔

ٹھیک دس منٹ بعد وہ سامنے تھا۔کلون کی دھیمی سی خوشبو اس کے ساتھ تھی۔ دوستانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ عمر خیام سے ہاتھ ملاتے ہوئے وہ پرجوش تھا۔''آپ کے اسٹوڈیو میں لگی فطری مناظر کی تصاویر غضب کی ہیں عمر۔ آپ واقعی کمال کے فوٹو گرافر ہیں۔''ابوذر نے عمر کے آفس کی نشست پر بیٹھتے ہی پہلی بات کی تو عمر کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ جسے ابوذر نے بہت غور سے دیکھا۔

''کیا بات ہے عمر خیام زندگی کی گاڑی میں ایسا کیا مسئلہ آ گیا ہے جو چہرے کی رونق ہی ماند ہو گی ہے؟''

''مسئلہ نہیں! اب تو مسائل ہیں ڈاکٹر صاحب!''

عمر نے دھیمے سے کہا، اور انٹر کام اٹھا کر ملازمین کو کیمرہ ٹیسٹنگ کے حوالے سے کچھ خصوصی ہدایات دیں۔'' چلیں پہلے آپ کے فوٹوز لے لیں، پھر گپ شپ کرتے ہیں۔''

عمر خیام نے ابوذر کے کام کو ترجیح دی تو وہ اس کو گہری نگاہ سے دیکھتا کھڑا ہو گیا۔فوٹوز کا یہ کام عمر خیام کے اسٹوڈیو میں کام کرنے والے افراد کرتے تھے۔لیکن ابوذر کا کام وہ خود کرنا چاہتا تھا۔ عرصہ سے وہ ایسے چھوٹے کام خود کرنا ترک کر چکا تھا۔ اسے کچھ مسئلہ بھی آیا لیکن پھر بھی ابوذر کے کام کو اس نے کسی کے حوالے نہ کیا۔ وہ اسکے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ فارغ ہو کر وہ دونوں پھر عمر خیام کے آفس آ گئے۔ ابوذر کے پاس حالانکہ وقت نہ تھا لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ عمر خیام کو اس کی ضرورت ہے۔اس نے اپنی بقیہ مصروفیت کو اپنے ذہن میں دہراتے ہوئے از سر نو ترتیب دیا اور اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا۔شام کے سات بج رہے تھے۔

ابوذر نے نوٹ کیا کہ عمر کا سیل فون وقتاً فوقتاً کال کی آمد کی اطلاعات دے رہا ہے لیکن وہ کسی بھی کال کو نہ سن رہا تھا۔ اس نے دیکھنا بھی گوارا نہ کیا کہ کون اسے یاد کر رہا ہے۔ اس وقت بھی اس کے چہرے سے باتیں

کرتے ہوئے بے اطمینانی کی لہر ابھرتی جسے وہ بخوبی دیکھ رہا تھا۔

وہ محض وقت گزاری کے لیے یہاں رکا بھی نہ تھا، سو اس نے اچانک سوال کیا۔

''آپ مجھ سے کیا شیئر کرنا چاہیں گے عمر خیام، یہ باتیں تو آپ کسی سے بھی کر لیں گے جو آپ کو مجھ سے زیادہ پر لطف کمپنی دے گا۔''

اپنی بات کہہ کر ابوذر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا تو عمر خیام کی آنکھوں میں چمک سی ابھری۔ وہ بھی شاید یہ ہی چاہتا تھا۔

''آپ خدا سے کیوں محبت کرتے ہیں ابوذر؟''

''اس لیے کہ میری خطاؤں کے باوجود وہ مجھے دن رات نواز رہا ہے۔'' ابوذر نے سوال سن کر جس انداز میں جواب دیا اس میں محبت ہی محبت تھی۔''

لیکن وہ مجھ سے وہ سب چھین رہا ہے جو میرے پاس تھا، جو میرے پاس ہے۔'' عمر خیام کے لہجے میں نم تھا۔

''میرے پاس ہنسی تھی، میرے پاس خوشگوار دن رات تھے، میرے پاس کامیابیاں تھیں۔'' اس نے ابوذر کو ''تھا'' کے بارے میں بتایا۔ تو ابوذر نے اپنے سامنے بیٹھے فوٹو گرافر کو دیکھا دنیا جس کی مہارت کا سکہ مانتی تھی، وہ کس قدر مضمحل لگ رہا تھا۔

''بس یہ ہی کچھ تھا آپ کے پاس......اور کچھ بھی نہیں۔'' ابوذر کے لہجے میں استعجابیہ کیفیت تھی۔ عمر خیام نے سامنے رکھے پیپر ویٹ کو انگلی سے ٹھوکا دیا۔ ''سب کچھ اس سے ہی جڑا تھا۔''

''مطلب آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہنسی تھی تو دوست احباب بنے، خوشگوار وقت تھا تو آپ کو قدرت نے بینائی دی۔''

''نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' عمر خیام نے دھیمے سے پہلو بدلا اور ابوذر کی بات کے درمیان اپنا مفہوم صاف کرنے کی کوشش کی جو بدستور ادھورا ہی تھا۔ اس دوران عمر خیام کا سیل پھر بجنے لگا۔ اب کے اس نے اسکرین پر آیا نام پڑھا اور کال ریسیو کر لی۔ نپے تلے انداز میں دو جملوں میں بات کر کے اس نے فون فوراً ہی بند کر دیا۔

''میری بیوی کا فون تھا، جب سے میرے بیٹے کو اٹیک ہوا ہے میں اس کا ہر فون ریسیو کرتا ہوں کہ نامعلوم کیا بات اس نے کرنی ہو۔'' عمر خیام نے فون ریسیو کر کے ابوذر سے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا تو

اس کے ہونٹوں کے گوشے پھیل گئے۔''

''اب کیسا ہے ینگ بوائے؟''ابوذر نے عمر خیام سے اشہد کے متعلق پوچھا تو اس نے اپنے سامنے رکھی میز کی دراز ہاتھ کی خفیف سی جنبش سے کھولی اور ایک البم نکال کر سامنے رکھ دی۔

ابوذر نے خاموشی سے اس کو کھول لیا۔ پہلے صفحے کی پہلی تصویر میں دو خوبصورت صحتمند لڑکے ماں باپ کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ ماں کی گود میں نومولود تھا۔ ابوذر کو تصویر میں دیکھنے میں دلچسپی نہ تھی لیکن عمر خیام کی فکر ضرور تھی۔ سو وہ صفحات پلٹتا رہا۔ بچے کی ایک آدھ تصویر ہی تھی جو اول صفحہ پر ماں کی گود میں تھی یا پھر کچھ ماہ کی عمر کی۔ لڑکے دونوں اپنی آنکھوں سے ذہین لگ رہے تھے، انکی آنکھوں میں باپ کی آنکھوں والی چمک نظر آ رہی تھی۔ اللہ جانے یہ چمک تھی یا فوٹو ایڈیٹنگ۔ ابوذر کے ذہن میں خیال ابھرا۔ البم مختصر تھی۔ صرف چار صفحات آخر صفحہ پر ایک فوٹو تھا۔ جو یقیناً اشہد تھا۔ صحتمندی اور ذہانت کی لہر جیسے کہیں غائب ہی تھی۔ ایک کمزور سا بچہ جو کہیں سے بھی پرانی تصاویر والا نہ لگ رہا تھا۔ ابوذر کی نگاہ اس تصویر ٹک گئی۔

''یہ ہے اشہد اب! یہ کیسا تھا یہ بھی آپ نے دیکھا اور یہ کیسی ہے یہ تو آپ جانتے ہی نہیں۔''عمر خیام نے ہاتھ بڑھا کر البم کا وہ صفحہ کھولا جس میں انعمت چھ ماہ کی تھی۔ یہ مجھے دیا جانے والا پہلا دکھ ہے۔ وہ بھی ایسا کہ جو ہر وقت ٹیس دیتا ہے۔''ابوذر نے نگاہ اونچی کر کے عمر خیام کو دیکھا جس آواز اسے گیلی ہوتی سی لگی تھی۔

''اور پھر اس دکھ کے بعد اس سے کتنے ہی مسائل پیدا ہوتے گئے۔ خدا مجھے سزا، پریشانی اور تکالیف میں ڈالتا جا رہا ہے، اشہد نے مجھے اذیت میں مزید ڈال دیا۔ فوٹوگرافی کے مقابلے میں بھی مجھے کوئی کامیابی نہیں دی تاکہ میں کسی بھی طرح خوش نہ ہوں۔''

ابوذر اسکو خاموشی سے سن رہا تھا، دیکھ رہا تھا، وہ سر جھکائے رب جو کہ ارحم الرّٰحمین ہے اس سے گلے کر رہا تھا۔

(جاری ہے)

☆☆☆

مزدلفہ میں آمد اور روانگی

عرفات سے روانگی کا منظر بڑا حسین تھا۔ ہر فرد شاداں وفرحاں۔ دینے والے نے دنیوی نعمتیں بھی آج خوب عطا کیں اور وقوف کا موقع بھی دیا۔ بھیک کی پکارلے کر جانب سٹیشن رواں تھے۔منزل مزدلفہ کی تھی جس متعلق میرے ذہن میں کوئی تصوراتی خاکہ نہ تھا۔ ہاں ایک سوال ضرور اٹھتا تھا۔ لوگ صفاء، مروہ، منیٰ، عرفات، حرم، اقصیٰ کے ناموں پر بچوں کے نام رکھتے ہیں، مزدلفہ کا ابھی تک نہیں سنا، اس کی کیا وجہ ہے۔ وجہ جاتے ہی سمجھ آ گئی۔

ٹرین سے اترتے ہی فقرہ سنائی دیا جس کا دل جہاں چاہتا ہے قیام کرلے۔نسیم اور تسنیم سے بات ہوئی وہ ابھی بھی بسوں کی قطار میں تھیں۔

ذرا سا آگے آئے۔ ارے...... چٹائیاں ہی چٹائیاں، دریاں ہی دریاں۔ ان پر بیٹھے بلکہ لیٹے نیم حاجی!!

ہم نے فوراً چٹائیاں بچھائیں ان پر جائے نماز بچھائے اور لیٹ گئے۔ یہ رات کے قیام کے لیے اللہ کے نبیؐ کی منتخب جگہ ہے جہاں پر انہوں نے مغرب ،عشاء کی قصر نماز ادا کر کے آرام کیا تھا اور مسجد تک نہیں پڑھی تھی، بس فجر کی نماز کے بعد منیٰ روانہ ہو گئے تھے۔

میاں صاحب تو وضو طہارت کے لیے روانہ ہو گئے اور میں نے آسمان پر نظر ڈالی۔ عرفات میں ندامت کے اشک کیا بہے وجود ہلکے پھلکے ہو گئے تھے۔ آسمان پر دس تاریخ کا چاند اس قدر روشن تھا جیسے مسکرا رہا ہو، اور کہہ رہا ہو۔

دیکھو...... مجھے دیکھو، میں وہ خوش نصیب ہوں جس نے آج سے سوا چودہ سو سال قبل اپنے آقائے نامدار کو یہاں دیکھا تھا......اسی جگہ پر!

میں بے تاب ہو کر اٹھی۔ یا الٰہی یہ ہر جانب مٹی کے اوپر بچھی چٹائیوں پر لوگ......امیر غریب گورے کالے سب آج خاک کے بستر پر!!

اسی طرح میدان حشر میں امیر غریب کالے گورے سب زمین پر ہوں گے ۔ سب فرق مٹ جائیں گے جیسے آج مٹ گئے ہیں۔ میں بے اختیار

درود کے ورد میں مصروف ہوگئی۔

عرفات میں مانگی دعاؤں رب کی بخششوں کے فیصلوں کے بعد آج رات عبادت کی چھٹی!! واہ کیا آسان دین ہے۔مزدلفہ کی رات تاروں بھری رات!!

عرفات میں اگر دن بھر رحمت کی بارش تھی تو مزدلفہ کی رات نور برس رہا ہے۔ ہر شخص اس نور کو محسوس کر رہا تھا۔ اللہ نورالسموٰت والارض کی تفسیر ہر سو نظر آرہی تھی۔

اس برستے نور میں آج جگہ لینے پر کسی کا جھگڑا نہ تھا۔ دوگز کی بھی آج ضرورت نہیں، بس جتنی زمین پر کمر سیدھی ہو سکے......سب خاکی ہیں اور خاک پر ہی خوش ہیں!!

یااللہ یہ تیرے بندے کتنے اچھے ہیں! مجھے آج ہر چیز اچھی لگ رہی تھی۔تین ہیلی کاپٹر مسلسل چار دن سے محو پرواز تھے۔ ایک جاتا تھا دوسرا اس سے قبل موجود ہوتا۔ بسااوقات تو ان ہیلی کاپٹروں کی پرواز اتنی نیچے ہوتی کہ لگتا تھا شاید کسی چٹائی پر ہی نہ لینڈ کر جائیں۔ رات بارہ بجے میں نے غسل خانوں کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ خیال تھا کہ صبح جلدی روانہ ہوں گے۔ ہیلی کاپٹر یا رب کی اتنی قربت کی وجہ سے نیند نہیں آسکی۔ سو جاگتے ہیں نظارے کرتے ہیں۔

وہاں پر انتظار کرنے والوں کی لمبی لائن۔ بنگالی، حبشی، ملائشیائی، یمن کی سب موجود تھیں۔ اپنی اپنی زبان میں گفتگو کر رہی تھیں، جن کو خدا ہی سمجھ رہا ہوگا۔ ہاں ایک سرائیکی فقرہ مجھے بھی سمجھ میں آیا اور ایسا کہ جس جس کو اس کی سمجھ آئی وہ ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہونے کو تھی۔مزدلفہ جہاں لوگ مٹی پر سونے کی تنگی برداشت نہیں کر سکتے، مجھے صحیح معنوں میں پکنک پوائنٹ لگ رہا تھا۔ اور وہ سرائیکی میں کہا گیا فقرہ ذہن میں ایسی فرحت بخش گیا کہ کوئی تصور نہیں کر سکتا۔

آسمان پر سے ہیلی کاپٹر ایک لمحے کے لیے غائب نہ ہوئے۔ انتہائی نیچی پرواز اور تیز آواز۔ایک سرائیکی خاتون دوسری سے حج کی مشقت کا رونا رونے لگی تو اس نے بے نیازی سے کہا۔

''نہ،توں ڈٹھا ایہہ ڈاہڈی،اوکھی ڈیوٹی تاں ایہہ ہیلی کاپٹر والے دی اے جیہڑا ترے ڈہینہ توں آسماں دے وچ ٹنگا بیٹھا اے۔خورے گوں موت کتھے کریندا ہوسی۔''

(تم اس ہیلی کاپٹر والے کو دیکھو جس کی ڈیوٹی سب سے سخت ہے، تین دن رات سے مسلسل آسمانوں

پر لٹکا ہوا ہے۔خدا جانے پیشاب ، پاخانہ کہاں کرتا ہوگا!!)

خیر وضو کرکے، فقرے کا لطف لے کے میں واپس اپنی چٹائی پر آئی۔ اتنے وسیع وعریض میدان میں جہاں اشتیاق چائے لینے گئے تو واپسی میں چالیس پنتالیس منٹ لگے۔ کوئی اتہ پتہ نہ تھا۔ پھر ان کا فون آیا۔ ''تم کہاں ہو؟''

میں نے مسکراتے ہوئے اپنی چٹائی پر کھڑی ہوکر نمایاں ہونے کی کوشش کی تو یہ میری پشت پر کھڑے تھے ڈھونڈ رہے تھے۔

اللہ نے پھر مسکرانے کا سبب پیدا کر دیا۔

''ایسے میں تم اپنے ٹھکانے پر کیسے پہنچ گئیں؟'' انہوں نے حیران ہوکر پوچھا

میں نے الجزیرہ کی بڑی بڑی کو چز کی طرف اشارہ کیا۔ جو ہمارے دائیں جانب موجود تھیں۔

''یہ نشانی ہے میری۔'' میں نے انہیں آگاہ کیا۔

اپنے ساتھ والی ہمسفر کو دیکھا جو آزاد کشمیر کے شاید چکوٹھی سیکٹر سے تعلق رکھتی تھیں اور پانی طلب کر رہی تھیں۔ پانی کی بوتل ان کے حوالہ کرکے میں نے اپنے دماغ کو پھر مصروف کیا۔ ذرا غور کرو منیٰ میں شاید اللہ عرش اتاریں گے کہ یہ انسانیت کی طرف سے اللہ کے مان کو بڑھانے کی جگہ ہے۔ عرفات میں وہ مقام ہوسکتا ہے جہاں شفاعت کے لیے رسولؐ اللہ کے آنسو نکل کر بہیں گے۔ اس لیے جسے ساری زندگی دعاؤں میں رونا نہیں آیا وہ بھی یہاں روتا ہے۔

مزدلفہ۔ اس سٹیشن کی حج کے لیے خاص اہمیت تو اللہ جانتا ہوگا۔ ہم سب اس لیے یہاں ٹھہرتے ہیں کہ رسولؐ اللہ ٹھہرے تھے لیکن وجہ؟؟ پھر ذہن میں جھما کا سا ہوا!

اوئے یہ جو چاند روشن روشن کرنیں بکھیر رہا ہے۔ تارے نکھرے نکھرے اور آسمان پرنور ہے...... ہر شخص بے فکرا...... شاید...... شاید! میرے دل نے سرگوشی کی جو دھک دھک کرتے میں نے سن لی۔

شاید اللہ تعالیٰ کی روائت یہاں ہو۔ اس لیے کہ ہر شے پرنور ہی نور ہے!! کوئی محنت، مشقت نہیں یہاں ،کوئی اضافی ریاضت وعبادت کا بوجھ نہیں بس مغرب ،عشاء کی قصر نمازیں اور فجر کی چار رکعت۔

ارے واہ! میں نے اپنے آپ کو تھپکی دی۔

کیا سہانا تصور ہے۔ اور حدیث مبارکہ میں تو واضح اشارہ ہے ہے۔ ''جو فجر کی سنتوں کو باقاعدگی سے

اول وقت پر ادا کرتا ہے وہ اللہ کو روز حشر اپنی ننگی آنکھوں سے ایسے دیکھے گا جیسے تم چودھویں کا چاند اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو۔

ایک اور حدیث میں یہی بشارت ان کے لیے ہے جو چاشت نوافل ادا کرتے ہیں اور صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا یا رسولؐ اللہ یہ نوافل کب ادا کیے جائیں تو آپؐ نے جواب دیا تھا۔

حین ترمض الفصال......

جب اونٹ کے بچے کے پاؤں جلنے لگیں، یعنی دھوپ میں تیزی آنے لگے تو۔

اللہ تبارک تعالیٰ کی روئت...... جسم پر سنسنی سی طاری ہوگئی۔

وہ عالم جب میرا اللہ بادلوں کے پرے میں فرشتوں کے ساتھ اس روئے زمین اور اس مقام پر اپنا عرش اتارے گا۔

اور خلقت، روئت کے ساتھ ہی سجدے میں گرے گی سوائے ان بدبختوں کے جنہوں نے اپنی جانو ں پر دنیا کی مختصر زندگی میں ظلم کیا ہوگا۔

مزدلفہ! اگر ایسے ہوگا تو کتنی بختوں والی ہے۔ میں پھر کنکریوں سے اٹی مزدلفہ کی سرزمین پر ناز کر رہی تھی۔

وہ رات بس ایسے ہی سوتے جاگتے گزری۔ تہجد کے وقت غسل خانے لمبی قطاروں میں گھرے تھے میں وضو پہ اکتفا کر کے آئی۔ نماز ادا کی، انہیں اٹھا کر وضو کے لیے بھیجا تو یہ پھر لمبے عرصے کے لیے غائب۔ ان کا موبائل میرے پاس ہی تھا۔ رابطہ کیسے کروں؟؟

خلق خدا تھی کہ مزدلفہ سے بھاگنے کو بے تاب رات بھر کا۔ روشن چاند گم ہو چکا تھا۔ جگہ جگہ پر لوگ پانی کی بوتلیں نکال کر تیمّم نما وضو کر رہے تھے۔ پانی کی دو گھونٹ والی بوتلوں کا یہ استعمال میں حرم میں بھی دیکھ چکی تھی۔ بس چند قطروں سے ہاتھ گیلا کیا۔ کلی کے نام پر چند قطرے منہ میں ڈال کر نکالے، منہ گیلا کیا، بس اسی ''لہوری غسل'' کی طرز پر وضو کیا اور دس، بیس، تیس لوگ اپنی اپنی جماعت ادا کرنے لگے۔ الجزیرہ والے عربوں نے بھی اسی طرح وضو کیا وہیں چٹائیوں پر نماز پڑھانا شروع کی۔ اس قدر عمدہ قرات کہ سرور آ گیا،

بے ساختہ کہا، قرآن واقعی عربی میں ہے، ہم ویسے اس کی تلاوت کا حق ادا نہیں کر سکتے جیسے عرب اہل زبان، فصیح اللسان!!

پورا گھنٹہ لگا کے یہ آئے تو مزدلفہ آدھے سے زیادہ خالی ہو چکا تھا۔ جلدی جلدی انہوں نے چار رکعت

ادا کیں۔ میں چٹائیوں کی تہہ لگاتے، بیگ کندھے پہ لٹکائے پہلے ہی تیار تھی۔ سلام پھیرتے ہی اب ہمارا رخ منیٰ اسٹیشن ٹو (2) تھا۔

ہر دو چار منٹ کے بعد نئی نویلی البیلی دوشیزہ کی طرح ٹرین آتی اور کچھ ہی لمحوں میں روانہ ہو جاتی۔ ہمیں کس پلیٹ فارم پر جانا ہے؟ اس جواب کے حصول کے لیے میاں صاحب کے ساتھ، میرے بھی کافی گناہ کم ہوئے ہوں گے۔ کبھی ادھر کبھی ادھر۔

بالآخر ان کا ذہن یکسو ہوا اور ہم دور پار کے ایک اسٹیشن پر پہنچے۔ کچھ دیر کے بعد ٹرین آتی۔ پلیٹ فارم پر جہاں ہم کھڑے تھے۔ ٹرین کے آنے پر اس کے شیشے کے دروازے کھلتے اور ہم ٹرین کے اندر موجود ہوتے۔

اناؤنسمنٹ ہوئی منیٰ کی۔ اور میں جو کہ جمرات اسٹیشن پر اترنا نہیں چاہتی تھی لیکن حکم شوہر ثواب عبادات کے مصداق اترنا پڑا۔ بہت بحث کی کہ پہلے جمرات چلتے کنکریاں مار کر آرام سے واپس آجاتے۔ ادھر بس ایک ہی ناں تھی سب کے جواب میں۔

امی کے پاکستان سے بار بار فون آرہے تھے، اشتیاق بیٹا، قانتہ کی کنکریاں تم مار لینا۔ کبھی مجھے کہتیں، سب سے زیادہ حادثے منیٰ میں جمرات کے مقام پر ہوتے ہیں۔ کنکریاں مارتے ہوئے تم خود نہ مارنے جانا بلکہ اشتیاق کو کہہ دینا۔

ہائے ممتا...... اولاد کی محبت !! میں نے امی سے بحث کی بجائے۔ جی اچھا کہہ کر تسلی کی لیکن انہیں بھی تو علم تھا کہ اسی اولاد کی محبت پر چھری پھیرنے جارہے تھے تو جمرات میں تین دفعہ تین شیطانوں نے ورغلایا، ڈرایا۔

اللہ اکبر! اب امی کو کیا علم کہ ان کی بیٹی تو شیطان کو کنکریاں مارنے کے شوق میں ''گوٹے گڈوں'' تک ڈوبی ہوئی ہے۔

جتنا رستہ ہم نے مزدلفہ سے ٹرین کے ذریعہ طے کیا اس سے زیادہ اب چلچلاتی دھوپ میں پیدل اپنے کیمپ جانے کے لیے طے کر رہے تھے۔ ''ان کا'' خیال تھا پہلے آرام پھر کام۔ میرا ساری زندگی کا ماٹو پہلے کام پھر آرام رہا ہے۔ خیر الرجال قوامون علی النساء کا دل وجان سے اقرار تھا اس لیے پیدل چلنے، گھومتے گھماتے پھرتے پھراتے ڈیڑھ دو گھنٹوں کے بعد اپنے کیمپ، مکتب چالیس پہنچے اور بس اپنے بستروں پر گر گئے۔ چائے پی، احرام کی پابندیاں تھیں وگرنہ نہا دھو کر تازہ دم ہونے کو دل چاہ رہا تھا۔ طوطے کے میاں مٹھو کی

طرح میں مسلسل ان کے پیچھے پڑی رہی اور پھر ہم دن کے ساڑھے بارہ بجے رمی کے لیے روانہ ہوئے۔ وہ عالم شوق کا تھا کہ دیکھا نہ جائے۔ ساری تھکن ایک طرف، بس کنکریاں مارنا ہیں کا شوق غالب۔ راستے میں انہیں پھر امی کی طرف سے ہدایت نامہ ملا۔ قانتہ کو رمی کے لیے نہ لے کر جانا۔

اور قانتہ نے بیس منٹ کے اندر رمی بھی کرلی! سب سے پہلے سب سے اگلی صف میں پہلی کنکری مارنے کے لیے اللہ اللہ کے کلمے کے ساتھ بازو اوپر کیا، ساتھ ہی جسم کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس وقت کی کیفیت میں بتا نہیں سکتی۔ اصل شیطان، اندر کا ایک اور شیطان، امریکہ۔ نفسی اور طاغوتی شیطانوں پر کنکریاں مارکر واپسی کا راستہ دوسرا ملا۔ عرب حکومت نے حادثات سے بچنے کے لیے کہ زیادہ تر لوگ یہیں پر بھگدڑ میں کچلے جاتے تھے۔ اب آنے جانے کے راستے الگ کر دیئے ہیں۔ آپ لاکھ اسی راستے سے جانا چاہیں جہاں سے آئے تھے انکی عقابی نگاہوں سے نہیں بچ سکتے۔ سو ہمیں بھی وہ لمبا، لمبا راستہ ہی اختیار کرنا پڑا۔

کیمپ میں پہنچ کر اب ایک ہی خواہش، طواف زیارہ جلدی سے ہوجائے۔ میاں صاحب کا حال یہ کہ ان تلوں میں تیل نہیں۔ ان کے کسی دلی خیر خواہ نے، آدھی رات کو حرم میں رش کم ہوتا ہے، کا بتا دیا تو بس امنا وصدقنا۔

میرا نظریہ یہ تھا کہ عام دنوں میں یہ ہوسکتا ہے لیکن پچاس ساٹھ لاکھ حاجیوں نے تین دنوں میں لازماً طواف زیارہ کرنا ہے۔ لہٰذا رش تو ہوگا جب بھی جاؤ۔ لیکن انہیں نہ ماننا تھا نہ مانے۔

☆☆☆

ڈاکٹر رخسانہ جبین*

نیل کے ساتھ ساتھ روشنی کا سفر

عالمی کانفرنس میں شرکت کی روداد...... جو صرف عالم اسلام کا منظرنامہ ہی نہیں، مسلمان عورت کو بھی نئے امکانات دکھا رہی ہے

اس وقت جبکہ امت مسلمہ بیرونی جانب سے کفار اور یہود و نصاریٰ کی یلغار اور اندرونی طور پر انتشار اور کفار کے کاسہ لیس حکمرانوں کی چیرہ دستیوں کی زد میں ہے، سوڈان میں ''تحریک اسلامی سوڈان'' کی آٹھویں عمومی کانفرنس ہوا کا ٹھنڈا جھونکا اور رگوں میں تازہ خون دوڑانے کا ذریعہ ثابت ہوئی۔ یہ کانفرنس پندرہ تا سترہ نومبر ۲۰۱۲ء خرطوم میں منعقد کی گئی۔ جس میں دنیا بھر سے اسلامی تحریکوں کے قائدین اور نمائندوں نے شرکت کی۔

پاکستان سے امیر جماعت اسلامی سید منور حسن صاحب کی قیادت میں پانچ رکنی وفد شامل ہوا، جس میں خواتین کی جانب سے سابقہ قیمہ حلقہ خواتین محترمہ عائشہ منور صاحبہ اور راقمہ شامل تھیں۔

۱۴ نومبر براستہ ابوظہبی تقریباً بارہ گھنٹے کا سفر کرتے ہوئے سہ پہر کے قریب خرطوم پہنچے میزبان (تحریک کے نمائندے) جہاز کی سیڑھیوں کے سامنے استقبال کے لیے موجود تھے۔ بہت اکرام سے ہمیں VIP لاؤنج میں لے جایا گیا۔ جیسے ہی چیکنگ مکمل ہوئی سامان آنے کا انتظار کرائے بغیر ہمیں گاڑیوں میں سوار کرا کے ہوٹل پہنچا دیا گیا جہاں محترم بھائی عبدالغفار عزیز صاحب (جو ایک دن پہلے تشریف لا چکے تھے) ہمارے منتظر تھے۔ نمازِ ظہر و عصر اور کچھ دیر استراحت کے بعد معلوم ہوا کہ بہن ''اشراقہ عمر الحسن'' ہماری میزبانی کے لیے تشریف لا چکی ہیں۔

اشراقہ بہن متعدد مرتبہ پاکستان آ چکی ہیں۔ یہ انٹرنیشنل وومن یونین (IMWU) کی ممبر اور فعال کارکن ہیں۔ انھوں نے گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ پاکستان کی بہنوں کا حال احوال پوچھا خصوصاً ڈاکٹر کوثر فردوس صاحبہ اور بہن راحیل قاضی صاحبہ کا۔ بعد نماز مغرب کانفرنس سے قبل اہم سیمینار تھا اشراقہ بہن نے بتایا گاڑی تیار ہے اور ہمیں کانفرنس ہال جانا ہے۔ کانفرنس ہال ہوٹل سے تھوڑے سے فاصلے پر تھا تقریباً پانچ منٹ بعد ہم وہاں پہنچے۔ یہ ہال نہیں بلکہ

بہت بڑا مرکز تھا جو بادی النظر میں کئی منزلہ ہوٹل لگ رہا تھا۔

لان میں موجود درختوں اور باڑ کو خوبصورت رنگ برنگی بتیوں سے سجایا گیا تھا۔ داخلی دروازے کے اوپر برقی قمقموں سے لکھا گیا تھا۔'**المؤتمر العام الثامن للحرکة الاسلامیه السودانیه**' یعنی آٹھویں عمومی کانفرنس برائے تحریک اسلامی سوڈان۔

سیمینار غالباً چوتھی منزل کے ایک ہال میں تھا۔ جب ہم پہنچے تو پروگرام شروع ہو چکا تھا اور بردار عبدالغفار صاحب فصیح و بلیغ عربی زبان میں میزبانی کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔اس وقت تیونس کے پروفیسر عبدالحمید صاحب ''عالمگیریت اس کے اثرات اوران کا حل'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کر رہے تھے۔انھوں نے امت کو درپیش تمام چیلنجز کا ذکر کیا مثلاً جدیدیت اور عالمگیریت کے تحت خاندان کو درپیش مسائل۔ خاندانی منصوبہ بندی کی آڑ میں مسلم ممالک کی نسل کشی اور تحدید نسل، مسلم معاشرے کی ہیئت ترکیبی کو درپیش خطرات لادینی معاشی نظام اوراسی طرح کے دیگر عنوانات پر سیر حاصل گفتگو کی۔

انھوں نے مسلم امہ کو ان خطرات سے آ گاہی حاصل کرنے اوراپنی دینی اور تمدنی بنیادوں کی جانب واپس لوٹنے کی ضرورت پر زوردیا اور وضاحت سے بتایا کہ نا صرف انفرادی زندگی میں قرآن وسنت کو مضبوطی سے تھاما جائے بلکہ ریاست اور حکومت بھی قرآن وسنت کے قانون پر بنائی جائے۔ اللہ کے قانون کو مکمل نافذ کیا جائے تو ان خطرات کا مقابلہ ممکن ہے۔

ان کے بعد سوڈان کے پروفیسر عبدالرحیم علی کا لیکچر تھا جس میں انھوں نے پوری تفصیل سے بتایا کہ سوڈان میں تحریک اسلامی نے کس طریقے سے جدوجہد کی بالآخر اللہ تعالیٰ نے اسے کامرانی سے ہمکنار کیا۔ ان کا لیکچر دیگر اسلامی تحریکوں کے لیے بہت مفید اور راہنما ہوسکتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اسلامی تحریک نے دین کی دعوت پھیلانے اوراس کو معاشرے میں عام کرنے کے لیے بہت سارے طریقے اختیار کیے جس میں چند اہم طریقے درج ذیل تھے۔

☆ سوشل ورک معاشرے میں مختلف خدمتی و دعوتی عنوانات مثلاً صحت، تعلیم، خدمت اور دیگر

معاشرتی اداروں میں NGOs کا قیام عمل میں لایا گیا۔

☆ یونین سازی مختلف دائروں میں کی گئی مثلاً طلباء، ویٹرنری ڈاکٹر، فارماسسٹ، ڈاکٹرز، یونینز وغیرہ اور پھر ان کے ذریعے کام کیا گیا۔نوجوانوں میں Ethical Movements چلائی گئیں۔

☆ سپورٹس کلبوں میں نوجوانوں پر کام کیا گیا۔

خواتین کی انٹرنیشنل کانفرنسز میں شرکت کی گئی۔

☆ مسجد کی اہمیت کوانھوں نے واضح کیا۔اسے تربیت اورسوشل ورک کا حصہ بنایا گیا۔

☆ ہنگامی امداد کے لیے تنظیم بنائی گئی۔

☆ فوج میں بھی کام کیا گیا۔

اسی طرح کام کرتے ہوئے آہستہ آہستہ اسلامی تحریک دوسری تمام این جی اوز پر غالب آ گئی اور بالآخر سوڈان میں اسلامی حکومت قائم ہوئی۔اب ۲۳ سال کے عرصہ میں اسلامی تہذیب ایک عمومی معاشرتی رجحان بن گیا ہے یعنی سوڈان کے معاشرے پر اسلامی کلچر نمایاں اور غالب نظر آتا ہے الحمدللہ۔

انھوں نے دیگر اسلامی تحریکوں کو ترغیب دی کہ سوڈان کے اس تجربے سے فائدہ اٹھایا جائے۔ان کے لیکچر کے بعد کچھ دیگر افراد نے اپنے اپنے خیالات اور تجربات کا اظہار کیا۔جن میں سوڈان سے سوشل ویلفیئر کی وزیر محترمہ امیرہ اور بنگلہ دیش کی اسلامی تحریک کے نمائندے شامل تھے۔سوڈان سے ہی IMWU کی سیکرٹری جنرل ڈاکٹر مظاہر عثمان نے خواتین کے کام پر روشنی ڈالی اور پاکستان کی خواتین کا بھی تذکرہ کیا۔رات گئے یہ سیمینار ختم ہوا۔

ہوٹل پہنچے تو ڈنر کے لیے ہال میں جانے کو کہا گیا وہاں کا منظر ہمارے لیے کچھ پریشان کن تھا۔تمام مہمان بیک وقت ڈائننگ ہال میں پہنچ چکے تھے اور ہمارے سوا کوئی اور خواتین نہ تھیں۔مردوں کے جم غفیر میں جا کر کھانا لینا اور پھر کسی جانب بیٹھ کر کھانے کی جگہ تلاش کرنا، دونوں کام انتہائی مشکل نظر آ رہے تھے۔ہم دونوں ایک سائیڈ پر کھڑی ہو کر سوچنے لگیں کہ کیا کیا جائے اور ساتھ ساتھ اپنے بھائیوں کی جانب بھی دیکھ رہی تھیں کہ شاید کسی کو خیال آ جائے اور ہماری مدد کر دیں۔میزبانوں کے لیے ہمیں درپیش صورتحال کو سمجھنا مشکل تھا۔ایک بھائی نے

بالکل راستے میں ایک میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہاں بیٹھ جائیں ورنہ اس پر بھی قبضہ ہو جائے گا۔ وہ اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھے کہ ہم کسی کونے میں قدرے پردے والی جگہ چاہتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اگر چہرے کا پردہ نہ کیا جائے تو مردوں اور عورتوں کا اختلاط نہیں روکا جا سکتا کیونکہ چہرہ کھلا ہو تو ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے، باتیں کرنے، محفلیں جمانے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں ہوتی اور نقاب نہ صرف عورت کی ''حیا'' کی تکمیل ہے بلکہ یہ معاشرے میں حیا اور حجاب کی روح کو قائم رکھنے کا بہت بڑا ذریعہ بھی ہے۔ اسی کی وجہ سے خواتین کے لیے تمام انتظامات الگ کرنے پڑتے ہیں۔ ہمیں اگرچہ اس وقت اپنے نقابوں کی وجہ سے کھانے میں مشکل پیش آئی جو بعد میں آزاد کشمیر سے محترم بھائی خالد صاحب اور بردار عبدالغفار عزیز صاحب کی مدد سے جگہ اور کھانا ملنے سے حل ہو گئی ......لیکن نقاب کی اہمیت وضرورت پر یقین مزید بڑھ گیا۔

رات تقریباً ایک بجے کے قریب کمرے میں پہنچے۔ ہمارا دن کافی طویل ہو چکا تھا اور تھکن سے برا حال تھا۔ لیکن پیارے اللہ نے انسان کی قوتوں کی بحالی کے لیے نیند کا جو قدرتی نظام بنا رکھا ہے وہ انسانیت کے لیے گراں قدر تحفہ ہے۔ وہ بھی کچھ ایسا موثر کہ جتنی تھکن ہو اتنی اچھی نیند آتی ہے۔ لہٰذا نماز ادا کرتے ہی اللہ کی عطا کردہ اس نعمت سے سرفراز ہوئے اور اس کے شکر گزار ہوئے الحمدللہ۔

صبح دس بجے کانفرنس کا باقاعدہ آغاز تھا اشراقہ بہن ہمیں ساتھ لے جانے کے لیے آ گئیں۔ ہوٹل کی لابی میں تمام مہمان کانفرنس میں جانے کے لیے جمع تھے۔ بھائی عبدالغفار عزیز صاحب نے ہمیں کارڈز دیے کہ اپنے برقعوں پر لگا لیں۔ کانفرنس ہال کے باہر پودوں کو بھی قمقمے اور جھنڈیاں لگا کر سجایا گیا تھا۔ جگہ جگہ مختلف نوعیت کے بینرز لگے تھے۔ عمارت کے دائیں جانب شامیانے لگائے گئے تھے۔ جہاں نماز کا انتظام تھا۔ داخلی دروازے سے باہر کئی سیکورٹی گیٹ لگے ہوئے تھے اور ہر ایک کو ان میں سے گزارا جا رہا تھا اس کے بعد سیکورٹی اہلکار کمپیوٹر لیے بیٹھے تھے اور اندر جانے والے ہر فرد کے کارڈ کو سکین کر رہے تھے۔

عمارت کی لابی میں داخل ہونے کے بعد موبائل فون کی سروس بند تھی اور سخت سیکورٹی تھی۔ بغیر اجازت کوئی فرد آگے نہ جا سکتا تھا۔ اندر داخل ہوئے

تو بہت بڑا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ دائیں جانب خواتین کی نشستیں تھیں اور بائیں جانب مرد تھے۔ درمیان میں کوئی پردہ وغیرہ نہ تھا بس ایک راہ داری کے ذریعہ نشستیں الگ کی گئی تھیں۔ بادی النظر میں خواتین کی تعداد کل کے تقریباً ایک تہائی لگ رہی تھی۔

کہیں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اشراقہ بہن راستہ بتاتے ہوئے ہمیں سٹیج کے قریب لے گئیں جہاں بیرونی مندوبین کی نشستیں تھیں اور شروع کی چند لائنوں میں تحریک اسلامی سوڈان کی قیادت بھی بیٹھی تھی جس میں خواتین بھی شامل تھیں۔ ڈاکٹر سعاد الفاتح جو سب سے بزرگ رکن کہلائی جاتی ہیں اور تمام مرد و خواتین ان کو استاذہ مانتے ہیں اور بہت اکرام کرتے ہیں، وہ پہلی صف میں کچھ خواتین کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ ہمیں IMWU کی جنرل سیکرٹری ڈاکٹر مظاہر کے ساتھ بٹھایا گیا جو بہت گرم جوشی سے ملیں۔ سٹیج کی پشت پر کانفرنس کا بہت بڑا بینر لگا تھا اور درمیان میں بہت بڑی سکرین تھی جس پر سٹیج اور ہال کی فوٹیج کلوز سرکٹ ٹی وی کے ذریعے آ رہی تھی۔ اسی طرح کی اس سے بڑی دو سکرینیں سٹیج کی دائیں اور بائیں جانب لگی تھیں۔ گویا اپنی نشستوں پر بیٹھ کے ہم پورے ہال اور مقررین کو بھی اچھی طرح دیکھ سکتے تھے جو اتنے بڑے ہال میں شاید سکرین کے بغیر نظر نہ آتے۔

ساؤنڈ سسٹم بہترین تھا۔ عربی نہ سمجھ سکنے والوں کے لیے ہیڈ فون اور انگلش اور فرنچ میں ترجمہ کا انتظام تھا۔ چند لمحوں بعد کانفرنس کا باقاعدہ آغاز تلاوت قرآن پاک سے کیا گیا تلاوت کرنے والا حافظ قرآن اہل زبان اور پھر تحریک کا فعال رکن بھی ہو اور غلبہ اسلام کے لیے جذبات بھی رکھتا ہو تو تلاوت کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ اس پر مستزاد آیات کا انتخاب تھا جو بہت برمحل اور حسب موقع تھا۔ (دیگر سیشنز میں بھی آیات کا انتخاب بہت عمدہ رہا۔)

تلاوت کے بعد اناؤنسر نے تمام شرکاء اور خصوصاً بیرونی مندوبین کو خوش آمدید کہا تقریباً تمام دنیا سے اسلامی تحریکوں کے قائدین جمع تھے۔ نمایاں قائدین میں مصر سے اخوان المسلمون کے امین العام، تیونس سے راشع الغنوشی صاحب، پاکستان سے امیر جماعت اسلامی سید منور حسن صاحب اور سیکرٹری جنزل لیاقت بلوچ صاحب، نگران امورِ

خارجہ عبدالغفار عزیز صاحب، کشمیر سے عبدالرشید ترابی صاحب اوران کے معاون خالد صاحب شامل تھے(اقلیتی ممالک سے بھی بڑی تعداد میں اسلامی تحریکوں کے قائدین اور نمائندے موجود تھے مثلاً تھائی لینڈ ، سری لنکا، وغیرہ البتہ ایران ، ترکی اور ہندوستان سے کوئی نمائندگی نہ تھی) اناؤنسر جیسے ہی کسی تحریک کے نمائندے کا نام لیتا شرکاء تکبیر کے نعرے سے اس کو مرحبا کہتے۔ اسی دوران ہال میں یکدم ہلچل اور اونچے نعروں کی آوازیں آنے لگیں سکرین پرایک شخصیت آتی دکھائی دی اوراناؤنسر نے اعلان کیا کہ تحریک اسلامی سوڈان کے امین العام شیخ علی محمد طہٰ تشریف لا رہے ہیں ۔ تمام شرکاء اٹھ کر کھڑے ہوگئے اورزوردارنعروں سے استقبال کیا۔

اس کے بعد کانفرنس کے تین روز کے لیے ''صدر'' کے انتخاب کا مرحلہ تھا اس میں تین نام پیش کیے گئے اور ہاتھ اٹھوا کر منظوری لی گئی۔ اس کے بعد ارکان نے خفیہ بیلٹ کے ذریعے ایک نام منتخب کیا اور ان کو کانفرنس کی صدارت سونپی گئی۔ انھوں نے ایک نائب خواتین میں سے اورایک مردوں میں سے مقرر کیا اور یہ سارا عمل تقریباً ایک شمیمہ میں مکمل ہوا۔ اس دوران دلچسپ واقعہ پیش آیا۔

صدر مجلس نے کہا کہ دوسرا نام جن صاحب کا پیش کیا گیا وہ مجھ سے زیادہ اس کے اہل اور معزز تھے۔ وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر انھیں ہدیہ تہنیت پیش کرنے کے لیے گئے۔ ہال سے اس کی بھرپور تحسین کی گئی۔ اس کے بعد سربراہ تحریک جناب علی محمد طہٰ صاحب کو خطاب کے لیے بلایا گیا تو ایک مرتبہ پھر ہال پر جوش نعروں سے گونج اٹھا۔ انھوں نے تمام مہمانوں کوخوش آمدید کہا۔ امت مسلمہ کو درپیش چیلنجز کا ذکر کیا اور سوڈان کی تحریک نے کس طرح ان کا مقابلہ کیا اور اسلام غالب ہوا۔ ملک کو درپیش اہم مسائل کا مختصر تذکرہ کیا اور پھر عالمی سطح پر درپیش چیلنجز کا ذکر کیا۔ المختصر ان کا خطاب دعوتی، فکری اور امید افزا تھا۔ انھوں نے عرب بہار اوراس کے بعد افریقی بہار کا تذکرہ کیا اور ایشیا میں اسلام کی بہار کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ اسی دوران سوڈان کے صدر عمر البشیر صاحب تشریف لے آئے۔ انھوں نے مختصر خطاب کیا۔ شرکا تکبیر اور تہلیل کے نعروں سے داد دیتے رہے۔

اس کے بعد بیرونی مندوبین کے خطابات کا

سلسلہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے مصر سے اخوان المسلمون کے سربراہ کا خطاب ہوا۔ انھوں نے آیات قرآن و حدیث سے مزین بہت خوبصورت تقریر کی اور بہت پر جوش طریقے سے امت کو اللہ کے راستے میں کھڑے ہونے اور جدوجہد پر ابھارا۔ انھوں نے بھی عرب بہار کا تذکرہ کیا۔

ان کے بعد درجہ بدرجہ مختلف ممالک کے سربراہان آتے رہے اور اپنے خیالات پیش کرتے رہے تمام شرکاء نے عربی میں تقاریر کیں۔ پاکستان سے امیر جماعت اسلامی جناب سید منور حسن صاحب کی تقریر انگلش میں تھی جس کا فی البدیہ عربی ترجمہ اونچی آواز میں ساتھ ساتھ نشر کیا گیا۔ آخر میں فلسطین سے خالد مشعل صاحب کو تقریر کے لیے بلایا گیا تو ایک مرتبہ پھر ہال کے تمام شرکا پر جوش نعروں کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور دیر تک فلسطینیوں کی امداد اور دعائیہ نعرے لگتے رہے۔

خالد مشعل صاحب نے فلسطین کی تازہ صورتحال پر روشنی ڈالی۔ ایک ایک کر کے اپنے شہداء کے نام گنے اور کہا کہ یہ جدوجہد جاری ہے۔ انھوں نے کہا کہ فلسطینیوں کی مثال ایسے ہی ہے جیسے قرآن نے کہا کہ **'الذین قال لھم الناس ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم فزادھم ایمانا و قالوا حسبنا اللّٰہ و نعم الوکیل'** سارا ہال ان کے ساتھ **'حسبنا اللّٰہ و نعم الوکیل'** کا ورد کرنے لگا۔ انھوں نے کہا جدوجہد کرتے ہوئے تمام مجاہدین شہید ہو گئے ہو سکتا ہے کہ کل کو خالد مشعل بھی آپ کے درمیان نہ ہو لیکن یہ جہاد جاری رہے گا۔ جب تک قبلہ اول کو آزاد نہ کرائیں ......ان کی تقریر کے درمیان بار بار جذباتی نعرے لگتے رہے اور وہ رک کر اہل سوڈان کا شکریہ ادا کرتے رہے۔

جونہی ان کی تقریر ختم ہوئی دف بجنے کی آواز آئی اور نوجوانوں کا ایک گروپ ترانے پڑھنے لگا۔ ہمیں اس کی پوری سمجھ نہ آ رہی تھی لیکن جذبات پہنچ رہے تھے۔

اس کے ساتھ ہی تقریباً اڑھائی بجے اس سیشن کا اختتام ہوا۔ نماز اور کھانے کے لیے وقفے کا اعلان ہوا۔ خواتین کی نماز کے لیے کافی دور انتظام کیا گیا تھا۔ وہاں عارضی طہارت خانے اور وضو گاہیں بھی بنائی گئی تھیں۔ ہمارے وہاں پہنچنے تک کافی خواتین نماز ادا کر کے جا چکی تھیں۔ نماز کے بعد ہماری

میز بان خواتین ایسی جگہ کی تلاش میں تھیں کہ جہاں بیٹھ کر ہم آرام سے کھانا کھاسکیں۔ بالآخر تلاش کے بعد دوسری منزل پر وہ ہمیں ایک اور ہال میں لے کر آئیں۔ یہ چھوٹا سا کانفرنس ہال تھا، غالبًا یہاں گول میز پروگرام ہوتے تھے۔ہمیں اندازہ ہوا کہ عمارت میں جا بجا مختلف ہال ہیں اور یہاں بیک وقت کئی پروگرامز کیے جا سکتے ہیں۔اسی دوران سوڈانی اخبار کی ایک خاتون صحافی سے ملاقات ہوئی۔ وہ کئی سوالات پوچھنا چاہتی تھی لیکن اس کو انگلش شو یا شویا(تھوڑی تھوڑی) آتی تھی اور ہمیں عربی شویا شویا۔لہٰذا اس وقت اس نے سوالات لکھ کر اشراقہ بہن کو دیے کہ ان کے جوابات مجھے لے دیں۔

رات کا ڈنر صدر عمر البشیر صاحب کی جانب سے ان کی رہائش گاہ پر تھا۔قافلے کی صورت میں تمام مہمان وہاں پہنچے۔ لان میں کھانے کے لیے میز لگائے گئے تھے اور مہمانوں کے نام درج تھے ہمارا نام بالکل شروع میں ایک میز پر درج تھا۔'السیدہ امینہ المراہ باکستان' ''محترمہ ناظمہ حلقہ خواتین پاکستان'' ہمارے ساتھ سوشل سیکورٹی کی وزیر محترمہ امیرہ کی سیٹ تھی لیکن ہم نے اس میز پر بیٹھنے کی معذرت کی اور کہا کہ ہمیں پیچھے جگہ دی جائے۔اس پر اشراقہ نے کہا کہ اسلام کا اصول تو یہی ہے کہ خواتین ایک جانب اور قدرے پیچھے رہیں مجھے آپ کی اس بات پر خوشی ہوئی ہے۔ پر تکلف کھانا سجایا گیا تھا بھلا ایک وقت میں انسان کتنا کھا سکتا ہے۔وہ بھی مجھ جیسا بندہ۔عائشہ باجی بھی کھانے میں کچھ تقلیل کرنے والی پائی گئیں۔ہم نے اشراقہ سے پوچھا کہ صدر کا گھر کون سا ہے؟ اس نے ایک عام سے مکان کی جانب اشارہ کیا جو ہمارے درمیانے متوسط طبقے کے گھروں کے مانند تھا۔اس نے کہا کہ صدر کی رہائش گاہ عام اور سادہ سی ہے۔صدارتی محل میں انھوں نے رہائش نہیں رکھی وہاں دفاتر وغیرہ ہیں۔

ہم نے پوچھا کہ آپ کے صدر کے اردگرد کتنی سیکورٹی ہوتی ہے اور جب صدر سفر کرتے ہیں تو کیا سڑکیں بند کی جاتی ہیں؟ اس نے بتایا کہ صدر اپنی گاڑی خود چلاتے ہیں۔صبح اٹھ کر پہلے مسجد جاتے ہیں پھر درس قرآن کے حلقے میں اور اس کے بعد دفتر۔ان کے لیے سڑکیں بند نہیں کی جاتیں وہ عام فرد کی طرح سڑک پر چلتے ہیں۔ ہمارے دل میں

حسرت ہوئی کاش یہ دن اللہ ہمیں بھی دکھائے۔

مجموعی طور پر سوڈان کے ماحول پر اسلام غالب نظر آتا ہے۔ تین دن میں ہمیں ایک آدھ کے سوا کوئی عورت غیر ساتر لباس میں نظر نہ آئی۔ سکول کالج کی بچیاں بھی جا بجا دیکھیں، جو حجاب میں ملبوس تھیں لیکن بغیر سکارف کوئی جوان بچی نظر نہ آئی۔ کوئی ایک بل بورڈ ایسا نظر نہ آیا جس پر کوئی قابل گرفت تصویر ہوتی۔ اول تو بل بورڈز تھے ہی کم اور جو تھے ان پر تصاویر نہ تھیں اگر تھی تو بچوں اور مردوں کی تھیں۔

جس گاڑی میں بیٹھے ایک آدھ استثناء کے سوا ڈرائیور نے تلاوت لگا رکھی ہوئی تھی۔ انتظامات اور سیکورٹی پر مامور بچیوں نے خاص با حجاب یونیفارم پہن رکھا تھا۔ البتہ یہ بات باعث حیرت تھی کہ ان کے ہاں بعض خواتین مردوں سے مصافحہ بھی کر رہی تھیں اور لوگ اختلاط سے بچنے کی کوشش بھی نہیں کر رہے تھے۔ عورتوں کے درمیان مرد آسانی سے جا بیٹھتے۔ بیرونی مندوبین سے بھی ان کی خواتین بلا جھجک سلام دعا کر رہی تھیں۔ حتیٰ کہ ہال میں دوران پروگرام بعض اوقات کوئی عورت اٹھ کر نعرے لگوانے لگ جاتی اور بسا اوقات عورتیں نعرے بازی میں مردوں سے بھی بازی لے جاتیں۔ اس بارے میں ہم نے اشراقہ بہن سے بات کی کہ آپ کے ہاں خواتین مردوں سے مصافحہ کیوں کرتی ہیں تو انھوں نے کہا کہ ہاں یہ درست نہیں، ایسا نہیں کرنا چاہیے اور سب خواتین ایسا نہیں کرتیں میں بھی نہیں کرتی یہ ہمارا رواج ہے۔ البتہ ہم لوگوں کو پہلے فرائض کی طرف متوجہ کرتے ہیں، یہ بعد کی بات ہے اور تدریجاً ایسی چیزوں کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔

تاہم مجموعی طور پر فضا پرسکون تھی اور پاکیزہ تھی۔ گلیوں، بازاروں، اداروں میں اسلام کا غلبہ اور برکات نظر آ رہی تھیں۔ اگلے روز جمعۃ المبارک تھا۔ صبح کا وقت مختلف ممالک کے وفود کی آپس کی ملاقاتوں کے لیے تھا لیکن چونکہ کسی اور ملک سے خواتین شامل نہ ہوئی تھیں لہٰذا ہماری ملاقات کسی سے نہ ہوسکی اشراقہ بہن نماز جمعہ سے کچھ دیر قبل آ گئیں اور ہمیں قریبی مسجد میں نماز کے لیے لے گئیں۔ معلوم ہوا کہ تمام بیرونی قائدین کرام شہر کی مختلف مساجد میں نماز جمعہ کی امامت کرا رہے ہیں لہٰذا سید منور حسن صاحب اور لیاقت بلوچ صاحب اور عبدالغفار عزیز صاحب نے بھی دیگر قائدین کی طرح تین مختلف

مساجد میں نماز پڑھائی۔

جمعہ کی شام خواتین کانفرنس تھی۔ اشراقہ بہن ہمیں تیاری کے لیے کہہ گئیں۔ محترم عبدالغفار بھائی سے معلوم ہوا کہ اس پروگرام کے لیے خواتین کے مرد ذمہ داران کو بھی کارڈز دیے ہیں اس پر بھی ہمیں حیرت ہوئی۔ مغرب پڑھ کے ہال میں پہنچے تو پروگرام شروع ہو چکا تھا اور آدھا ہال مردوں سے بھرا ہوا تھا۔ سوڈان حلقہ خواتین کی سابقہ ناظمہ اس وقت تقریر کر رہی تھیں انھوں نے سوڈان میں خواتین کے کام پر روشنی ڈالی۔ اس وقت ''عورت'' کے نام پر مغرب کی سازشوں اور ان کا کیسے حل کیا وغیرہ تفصیل سے بیان کیا۔

سٹیج پر خواتین کے ساتھ ایک ''صاحب'' براجمان تھے معلوم ہوا کہ دوانا ؤنسرز ہیں ایک مرد اور ایک خاتون ان کے بعد دو خواتین نے خطاب کیا۔ ایک نے سوڈان کی معاشی ترقی میں عورتوں کے کردار پر روشنی ڈالی۔ پروگرامز بہت اچھے تھے اور سب کی پریزنٹیشن بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ لیکن بدنصیبی سے وقت کی کمی کی وجہ سے ان کے بولنے کی رفتار اتنی تیز تھی کہ ہمارے لیے عربی سمجھنا مشکل تھا اور مترجم صاحب بھی اتنی تیز رفتاری کا ترجمے میں ساتھ نہ دے پا رہے تھے۔ ان مقررات کے بعد کچھ لوگوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور خواتین کے کام کی تحسین کی۔ ایک صاحب نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی گفتگو کے مطابق آپ کی پارلیمنٹ میں خواتین کی تعداد تقریباً ۴۰ فیصد ہے۔ اتنی تو امریکہ میں بھی نہیں تو اس کے خاندان پر اثرات اچھے نہیں ہوتے۔

اس کے بعد ڈاکٹر سعاد الفاتح صاحبہ نے بہت گرمجوشی سے ان کو جواب دیا لیکن مترجم ان کا ساتھ نہ دے پایا۔ بس اتنا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ خواتین کے کردار کے بارے میں بہت پرجوش تھیں۔ اس کے بعد قائد تحریک شیخ علی طٰہٰ صاحب کے ساتھ تمام بین الاقوامی ذمہ داران تحریک کی نشست تھی اس نشست میں کچھ دیر کو ہم نے بھی شرکت کر لی اور بہت اچھا لگا کہ تحریک اسلامی سوڈان کے جنرل سیکرٹری صاحب نے محترم قائدین کرام کے سامنے سوڈانی تحریک اور ملک کے اندرونی مسائل رکھے اور سب سے مشورہ چاہا۔ یہ نشست بہت اپنائیت اور اخلاص سے بھرپور لگی کیونکہ عمومی رجحان تو یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کے سامنے اندرونی کمزوریوں کو آشکار نہ ہونے دیا

جائے۔ یہ اسلام کی برکات اور باہمی اعتماد و بھائی چارے کی بہترین مثال تھی جو تحریک اسلامی سوڈان کی طرف سے پیش کی گئی۔

اگلے روز اشراقہ بہن ہمیں ایک نمائش میں لے گئیں جو کتاب میلہ بھی تھا اور مختلف قائدین تحریک و علماء کرام کے تعارفی چارٹس بھی ان کے مختصر حالات زندگی اور تصانیف کی تفصیل کے ساتھ آویزاں تھے۔ ان میں سب سے پہلا چارٹ سید حسن البناء شہید کے بارے میں تھا۔ دوسرا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور تیسرا سید علی حسن ندوی کے بارے میں تھا۔ انھی میں غالباً چوتھے یا پانچویں نمبر پر علامہ اقبالؒ کے بارے میں چارٹ آویزاں تھا۔ اس پر ہمیں خوشی بھی ہوئی اور اہل سوڈان کی دقیق نظری پر حیرت بھی۔ علامہ اقبال اردو اور فارسی کے شاعر ہیں ہمیں علم نہیں کہ ان کی کسی کتاب کا عربی میں ترجمہ ہوا ہو (شاید ہو) اس کے باوجود ان کا شمار قائدین تحریک اور علماء میں کرنا یقیناً سچی قدر دانی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال نے شعر اور استعارے کی زبان میں امت مسلمہ کو وہی پیغام دیا جو سید مودودیؒ اور سید قطب شہید نے تفاسیر قرآن کی شکل میں دیا۔ امت کی بیداری اور نشاطِ ثانیہ ان کا خواب بھی تھا اور پیغام بھی۔ کاش آج کی نسل نو ان کے کلام سے استفادہ کر سکے۔ اس نمائش میں بیسیوں دیگر علماء کرام کے تعارف آویزاں تھے لیکن ہمیں ملاقات کے لیے سوڈانی تحریک کی ذمہ دار خواتین کی طرف جانا تھا لہٰذا اس کو ادھورا چھوڑ کر آگے نکل گئے۔

اشراقہ بہن کے ساتھ اجتماع گاہ کی طرف گئے تو معلوم ہوا کہ ابھی کوئی تنظیمی سیشن ہو رہا ہے اور اندر سخت سیکورٹی ہے۔ سیکورٹی کے کئی مراحل سے گزارنے کے بعد اشراقہ بہن ہمیں ملاقات کے ہال تک لے جانے میں کامیاب ہوئیں۔ جہاں کافی انتظار کے بعد ذمہ داران بہنیں پروگرام سے فارغ ہو کر تشریف لائیں ان میں صدر عمر البشیر صاحب کی اہلیہ، امین العام صاحب کی اہلیہ نگران امور خارجہ اور ان کی معاونین، ڈاکٹر مظاہر عثمان صاحبہ اور کچھ دیگر خواتین موجود تھیں۔

باہمی تعارف ہوا۔ تمام خواتین انتہائی پڑھی لکھی اور تحریکی طور پر تجربہ کار تھیں۔ اکثریت اچھی انگریزی بول سکتی تھی۔ ان کی امور خارجہ کی نگران بہن سے ہم

نے پوچھا کہ آپ کے دوسرے ممالک کی خواتین سے کتنے روابط ہیں۔ جواباًانھوں نے بتایا کہ زیادہ تر عرب ممالک سے رابطے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمیں آپس میں جتنا مربوط ہونا چاہیے ویسے نہیں ہیں۔

ہمارااس بات پر اتفاق تھا کہ ہمیں متحد ہو کر تمام مسلم خواتین کے لیے دنیا میں آواز اٹھانی چاہیے۔ مثلاً اسے حجاب کا حق ملنا چاہیے اور کسی کو اختیار نہیں دیا جا سکتا کہ اس پر پابندی لگائے۔ گفتگو سے اندازہ ہوا کہ سوڈانی خواتین عورت کے بارے میں عالمی ایجنڈے سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ عورت کی میراث اور گواہی کے بارے میں جو غلط فہمیاں جدید معاشروں میں پھیلائی جا رہی ہیں ان کا تدارک ہمیں مل کر کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے تقریباً چودہ ممالک کی خواتین کو اس پروگرام میں مدعو کیا تھا لیکن آپ کے سوا اور کسی ملک سے خواتین شامل نہ ہوئیں اس پر ہمیں تاسف ہے۔ ہمیں اکٹھا ہونا چاہیے، ہماری بار بار نشستیں ہونی چاہئیں تاکہ ہم مسلمان عورت کو درپیش مسائل کا جائزہ لیں۔ خاندان کو درپیش چیلنجز کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے بغیر نکاح کے خاندان یا CEDAW کی دستاویز میں درج 'بن بیاہے جوڑوں' کی مذمت کی اور کہا یہ حرام ہے اس پر بات ہونی چاہیے۔ ہم نے انھیں بتایا کہ ہم CEDAW کے ایجنڈے کے خلاف اسلامی نقطۂ نظر رکھتے ہیں، اس کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں، لٹریچر تیار کرتے ہیں اور عوام الناس کی آگاہی کے لیے لیکچرز کا اہتمام کرتے ہیں۔

جواباً انھوں نے بالکل درست کہا کہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ایک ایک ملک میں علیحدہ یہ کام ہو رہا ہے اگر ہم متحد ہو کر ایک منصوبہ بنا کر کام کریں تو مسئلے کا حل نکل سکتا ہے یا ذمہ داری پوری ہو سکتی ہے۔ نیز ہمیں ایک دوسرے کے تجربے سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

اس گفتگو کے بعد ڈاکٹر مظاہر اور دیگر بہنوں نے ہمیں دعوت دی کہ پاکستان حلقہ خواتین کے کام کے بارے میں ہمیں کچھ بتائیں۔ میں نے تفصیل سے بتایا کہ ہمارا مقصد حکومت الٰہیہ کا قیام ہے اس مقصد کے لیے ہم ملک بھر میں اپنے تین نکات کے تحت دعوت کا کام کرتے ہیں۔ خواتین کو رجوع الی اللہ اور منافقت دور کر کے پورے کے پورے اسلام

میں داخل ہو جانے کی دعوت دیتے ہیں۔اور زمام کار فساق و فجار سے لے کر صالحین کے ہاتھ میں دینے کے لیے اجتماعی جدوجہد پر ابھارتے ہیں۔ ہمارا وسیع کام ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے دروس قرآن کے حلقے ہیں جہاں ہم ناظرہ وترجمہ وتفسیر سے قرآن پاک پڑھاتے ہیں۔

اس کے علاوہ حلقہ خواتین کی تعلیمی سرگرمیاں، تعلیمی ادارے ۱۴ جامعات المحصنات ،۴۳ قرآن انسٹی ٹیوٹس،۱۳۴ کمیونٹی سکولز بھی قائم ہین جو طالبات خواتین اور بچوں کو بالترتیب زیور تعلیم سے آراستہ کر رہے ہیں اور یہ سب تقریباً مفت تعلیم فراہم کرتے ہیں اس پر وہ خاصی حیران ہوئیں اور پوچھنے لگیں کہ آپ کے پاس فنڈز کہاں سے آتے ہیں میں نے بتایا کہ سب سے پہلے ہمارے ارکان کی ''جیب'' سے اس کے بعد ہم معاشرے کے مخیّر حضرات سے جمع کرتے ہیں۔انھوں نے اس کی تحسین کی۔

اس کے علاوہ حلقہ خواتین کے خدمتی کام، شعبہ حادثات، جیلوں، عدالتوں میں خواتین کو مفت قانونی مدد کی فراہمی اور جیلوں میں بچوں کی اخلاقی وفنی تربیت کے بارے میں آگاہ کیا اور اسی طرح خواتین کے دستکاری او رسلائی سنٹرز اور فلاح خواتین کے مختلف منصوبوں کے بارے میں بتایا۔

اسی طرح باہمی تعارف اور آگاہی کی ایک اچھی نشست ہوئی اور ہمیں تقویت ملی کہ سوڈان کی اسلامی تحریک کی خواتین نہ صرف امت مسلمہ کو درپیش خطرات سے آگاہ ہیں بلکہ اپنی ایک اقدامی تیاری Proactive Agenda بھی رکھتی ہیں کہ دنیا میں اسلامی اقدار کو کیسے پھیلانا ہے اور دین کو کیسے غالب کرنا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنے اس پروگرام پر تندہی سے کام کر رہی ہیں اور تقریباً ۲۵ سال کے عرصے میں آج واقعی سوڈان کی سڑکوں اور گلیوں میں اسلام بہت مضبوط نظر آتا ہے۔کانفرنس میں ہمیں بچے کہیں نظر نہ آئے اس پر ہمیں حیرت تھی کہ اتنی بڑی تعداد میں خواتین شریک ہوتی ہیں۔تین دن کے لیے تو ان کے بچے کدھر ہیں! تو انھوں نے بتایا کہ ہمارا خاندانی نظام بہت مضبوط اور فعال ہے۔ بچے گھروں میں دادی، نانی یا خالہ اور پھوپھی وغیرہ کے پاس رہتے ہیں۔اگر وہ نہ ہوں تو ہمسائیوں کے گھر چھوڑ کر آتے ہیں۔ باہمی تعاون کی یہ فضا بہت قابل قدر تھی اور اس کا یہ فائدہ بھی تھا کہ دوران پروگرام مکمل خاموشی تھی۔

سوائے نعروں کے کوئی اور شور اور کھلبلی نہ تھی۔ (البتہ بچوں کے ساتھ رکھنے کی افادیت اپنی جگہ ہے) ان کے معاشرے پر فیملی پلاننگ کے اثرات بھی محدود تھے۔

اس نشست کے بعد ہم نے اشراقہ بہن سے کہا کہ ہم خرطوم دیکھنا چاہتے ہیں، ممکن ہو تو بازار بھی دیکھ لیں گے۔ چنانچہ نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم اشراقہ بہن کے ہمراہ شہر کی جانب نکل پڑے سڑکوں کی حالت ہمارے اندرون شہر سے اچھی تھی۔ عموماً اوسط درجے کے مکانات تھے۔ صفائی کی صورتحال بھی ہمارے ملک سے کافی بہتر تھی۔ اس وقت سکولوں سے چھٹی کا وقت تھا جا بجا بچے گھروں کو جاتے نظر آ رہے تھے اور یہ دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی تھی۔ تمام بچیوں نے سکارف لے رکھے تھے بہت سی بچیوں نے گاؤن بھی پہن رکھے تھے۔ البتہ یہ قابل قدر بات تھی کہ سب کے لباس ساتر اور پورے شہر میں ایک آدھ کے سوا کوئی عورت ہمیں غیر ساتر لباس میں نظر نہ آئی۔ دل میں بہت حسرت ہوئی کہ اے اللہ ہمارے ہاں بھی اسلام کو غالب تہذیب بنا دے۔

ہماری میزبان اشراقہ بہن راستے میں مختلف مقامات کی وضاحت کرتی جا رہی تھیں۔ اس اثنا میں سابقہ صدارتی محل آیا تو انھوں نے بتایا کہ یہ صدارتی محل ہے لیکن صدر یہاں نہیں رہتے بلکہ یہاں دفاتر وغیرہ ہیں۔ خرطوم کی سڑکوں پر چلتے ہوئے یہی گمان ہو رہا تھا جیسے لاہور اور کراچی میں ہیں۔ البتہ دو فرق تھے ایک تو ٹریفک کا اژدہام نہ تھا اور دوسرے صفائی اور سڑکوں کی حالت پاکستان سے بہتر تھی۔ آبادی بھی ہمارے ہاں سے کافی کم لگ رہی تھی۔ اور سڑکوں پر گھومتے پھرتے لوگ کم ہی نظر آ رہے تھے۔ کچھ دور ہی گئے تھے کہ جگہ جگہ ''پکنک سپاٹ'' نظر آنے لگے ...... رنگ برنگی پلاسٹک کی کرسیاں جگہ جگہ لگی ہوئی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی کھوکھا نما دکانیں تھیں......

معلوم ہوا کہ دریائے نیل کے کنارے آ گئے ہیں ...... ڈرائیور نے ایک جگہ گاڑی روک لی۔ اشراقہ بہن نے کہا کہ نیچے اتر کر ''نیل'' کا نظارہ کریں۔ انھوں نے دعوت دی کہ کشتی میں بیٹھ کر کچھ دور تک چلیں۔ لیکن وقت کی کمی کے پیش نظر ہم نے مناسب نہ سمجھا البتہ کچھ دیر کو ہم دریا کے کنارے کھڑے رہے۔

دریائے نیل خراماں خراماں بہہ رہا تھا اور میں

کنارے پر کھڑی دور ماضی میں جھانک رہی تھی اور اس دریا کی خوش نصیبی پر رشک کر رہی تھی۔ یہ دریا جس میں خلیفہ رسولؐ رشک امت مسلمہ حضرت عمرؓ نے اس کے خشک ہونے پر رقعہ لکھ کر ڈالا کہ ''اگر تو اللہ کے حکم سے بہتا ہے تو بہنا شروع ہو جا'' اور دنیا نے یہ کرامت دیکھی کہ خشک دریا کے اندر پانی کے سوتے بہہ نکلے......

اے نیل! تو کتنا خوش قسمت ہے آج عمرؓ کے ایک غلام عمر البشیر اور ان کی جماعت تحریک اسلامی سوڈان نے ایک مرتبہ پھر تیری فضاؤں کو اسلام کی بہار سے معطر کر دیا ہے۔

اے نیل! تو دور تک سوڈان کی سرزمین پر بہتا چلا جا رہا ہے اور اب اسلام کی یہ بہار تیرے ہمراہ مصر کی مبارک سرزمین میں داخل ہو چکی ہے اور اب ''عرب بہار'' ایک خوش کن علامت بن چکی ہے۔ میرا دل چاہا میں پکار پکار کر کہوں اے نیل! ہمارا ''نیلم'' بے بس مسلمانوں کے تڑپتے لاشوں اور ناحق بہتے خون سے رنگین ہو رہا ہے۔ ہمارے پنج دریا ظالم اور جابر دشمنوں کی چیرہ دستیوں سے خشک تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اے نیل! کوئی دعا ہمارے لیے بھی کہ کوئی عمرؓ، کوئی صلاح الدین ایوبی، کوئی مسیحا، کوئی دردمند، جو اس خطے پر چھائی طویل خزاں کو بہاروں سے بدل سکے۔ اس عمرؓ (کہ قیصر و کسریٰ جن کے دبدبے سے لرزتے تھے) کا کوئی جانشین جو آج کے فرعون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔ ہم لاشیں اٹھا اٹھا کر تھک گئے ہیں۔ کوئی جو دست قاتل کو پکڑ سکے۔

اے نیل! اے اسلام کی بہار سے آشنا کرنے والے سوڈانی تحریکی ساتھیو! پاکستان کی اسلامی تحریک کے لیے بھی ہاتھ اٹھاؤ کہ اللہ اس کی جدوجہد کو بھی قبول فرمائے۔ وہ برکات عطا فرمائے کہ یہ ملک ''پاک'' ہو جائے۔ یہ مدینہ طیبہ کا ہم نام، مثل مدینہ ''طیب'' بن جائے۔

ہاں! اے اللہ یہاں کام کرنے والی تمام اسلامی جماعتوں کو اس طرح کر دے کہ وہ مسالک کی بجائے اقامت دین کی طرف بلائیں۔

اللہ! ہر طرح کا جہاد کرنے والوں کو اپنی نصرت سے نواز دے۔ اے مالک مہربان! یہ زمیں کا وہ پاک خطہ ہے جہاں تیرے دین کی سربلندی کے لیے برسوں سے محنت جاری ہے۔ یہاں مجددین بھی ہیں،

مجاہدین بھی اور مبلغین بھی ہیں۔علماء بھی ہیں مدارس بھی ...... تیرے نبی ﷺ کے دیوانے بھی ہیں اور ان کے دین کو مکمل نافذ کرنے کے لیے دامے درمے سخنے جدوجہد کرنے والے فرزانے بھی......

کیمرے والے کی آواز نے چونکا دیا۔اس نے تصویر بنوانے کی پیشکش کی تو مجھے یاد آیا کہ میرے پاس بھی موبائل ہے۔ میں نے بہتے دریا کی خوش قسمت لہروں کی تصویر بنائی۔ رنگ برنگی کرسیوں کو تصویر میں محفوظ کرلیا۔اشراقہ بہن نے ہمارے لیے ایک یادگار عکس محفوظ کیا۔اور ہم نے حسرت اور امید بھری نظروں سے دریائے نیل کو خدا حافظ کہا۔

ہوٹل واپس آئے تو چائے کی طلب میں ایک دلچسپ واقعہ رونما ہوا میں نے ریستوران میں فون کیا کہ ''دو کپ چائے'' بھجوا دیں اس وقت فون پر جو خاتون تھیں۔شاید انگریزی اچھی طرح نہ سمجھ سکتی تھیں لیکن مجھے ''اوکے'' کہا کچھ ہی دیر میں دروازہ کھٹکا میں نے کھولا تو بیرا ہاتھ میں دو خالی کپ لیے کھڑا تھا۔ میں نے حیران ہوکر پوچھا یہ کیا؟ کہنے لگا آپ نے ''دو کپ'' منگوائے ہیں۔تو میں نے اسے عربی اور انگریزی ملا کر بتایا کہ ہمیں خالی کپ نہیں بلکہ چائے چاہیے......

بعد از نماز مغرب کانفرنس کا آخری سیشن تھا۔ اشراقہ بہن کے ساتھ ہم روانہ ہوئے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پروگرام کا آغاز ہو چکا تھا۔حسب توقع روح پرور تلاوت ہو رہی تھی اور اس کے بعد ان بیرونی مندوبین کو دعوت خطاب دی گئی جو پہلے سیشن کے بعد تشریف لائے تھے۔

ان میں شام کی تحریک کے نمائندے بھی شامل تھے۔ان کی تقریر کیا تھی شام کی قتل گاہ کی تصویر کشی تھی۔اور ایسی تصویر کشی تھی کہ مردوں کی آنکھوں میں آنسو دیکھے گئے ......انھوں نے سب سے دعا اور مدد کی درخواست تو کی لیکن ساتھ ہی یہ خوشخبری سنائی کہ ان شاء اللہ جلد شام میں بھی مجاہدین فتح یاب ہوں گے اور بہار آنے والی ہے۔ ان کے بعد سویڈن، مالی، تھائی لینڈ، صومالیہ اور کچھ دیگر ممالک سے آئے ہوئے قائدین و مندوبین نے خطاب کیا۔سری لنکا سے جو بھائی تشریف لائے تھے انھوں نے کہا کہ میں نے ایک مرتبہ خلیل حامدی صاحب مرحوم سے دریافت کیا کہ آپ کے خیال میں کس ملک میں سب سے پہلے اسلامی تحریک غالب ہوگی (یا انقلاب آئے گا) تو

انھوں نے کہا کہ میں نے یہ سوال مولانا مودودی سے پوچھا تھا تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ اس کا علم تو اللہ کو ہے لیکن میرا اندازہ ہے کہ ایسا سب سے پہلے سوڈان میں ہوگا۔ اس پر شرکاء نے تکبیر کے نعرے لگائے اور ہم مولانا محترم کی بصیرت پر رشک کرنے لگے۔

ان تقاریر کے بعد ایک مرتبہ پھر حسب توقع اور حسب حال آیاتِ قرآنی کی تلاوت کی گئی۔ جن میں فتح ونصرت کی بشارت اور مسلمانوں کے لیے جدوجہد کا پیغام تھا گویا یہ بھی ایک تقریر تھی لیکن یہ اللہ کا پیغام تھا جو ایک مقرر اللہ ہی کی زبان میں اور انھی الفاظ میں اللہ کے پیارے بندوں کو پہنچا رہا تھا جنھوں نے اپنی زندگیاں اس کی راہوں میں جہاد کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔ اس تلاوت کا مزہ کچھ اور ہی تھا۔ آخر میں سوڈان کے امین العام تکبیر کے نعروں کی گونج میں آئے اور الوداعی خطاب کیا۔ انھوں نے تمام بین الاقوامی شرکاء کا شکریہ ادا کیا اور تمام حاضرین کو بھرپور جدوجہد اور کوشش کا پیغام دیا ان کی تقریر انتہائی پرجوش تھی۔ فلسطین، شام اور دیگر مقبوضہ مسلم ممالک کا بھی تذکرہ کیا گیا۔ آخر میں ان کی دعا بھی تقریر کی طرح ہی پرجوش تھی وہ قرآنی دعائیں اپنی پوری آواز کے ساتھ اور خوش الحانی کے ساتھ پڑھ رہے تھے اور حاضرین اُسی جوش وخروش سے آمین کہہ رہے تھے۔ یوں آنسوؤں کے ساتھ اس کانفرنس کا اختتام ہوا۔ ہم سب (بیرونی مہمانان) کو روک لیا گیا کہ امین العام صاحب تمام مہمانوں سے انتہائی اہم ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ رات بہت ہو چکی تھی اور بہت سارے مردوں میں صرف ہم دو خواتین تھیں لہٰذا ہم نے اجازت چاہی اور واپس آ گئے۔

اگلے روز بعد ظہر ہماری فلائٹ تھی ہم نے اشراقہ بہن سے درخواست کی کہ ہمیں انٹرنیشنل وومن یونین (IMWU) کا دفتر دکھا دیں۔ چنانچہ ہم دس بجے کے قریب دفتر کے لیے روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر مظاہر صاحبہ، ڈاکٹر احسان گبشاوی اور دفتر کا عملہ ہمارے استقبال کے لیے موجود تھا۔ ایک پرانی سی عمارت میں یہ دفتر قائم کیا گیا تھا۔ بہنوں نے بتایا کہ صدر عمر البشیر صاحب نے یہ دفتر یونین کو عنایت کیا ہے۔

دفتر دیکھنے میں کچھ خستہ حال ہی تھا لیکن کام کے لحاظ سے ماشاء اللہ بھرپور تھا۔ بہنوں سے تعارف ہوا ڈاکٹر مظاہر صاحبہ نے لندن سے انگلش میں ماسٹر کیا،

خرطوم یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی۔ یہ اسلامک یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر تھیں لیکن اب IMWU کی ذمہ داری کی وجہ سے ملازمت چھوڑ دی ہے اور پورا وقت ادھر ہی لگاتی ہیں۔

ڈاکٹر احسان، صحت اور مہاجرین کے محکموں میں وزیر رہ چکی ہیں۔ شیخہ آسیہ طٰہٰ حافظ قرآن اور عالمہ ہیں اور دعوت کے شعبے کی انچارج ہیں۔ انھوں نے اپنے دعوۃ کے کاموں کی تفصیل بتائی کہ ہم ہر جگہ کام کرتے ہیں، پارکوں میں، سکولوں میں، ہسپتالوں میں......مثلاً ہسپتالوں میں ہم طبی، فقہی مسائل بتاتے ہیں۔ سکولوں میں لیکچرز کرتے ہیں۔ اساتذہ کے لیے تربیتی پروگرام کرتے ہیں۔ قرآن پاک کی تفسیر پڑھاتے ہیں۔

فروری میں خرطوم میں میلہ لگتا ہے۔ اس میں حجاب کے سٹال بھی لگاتے ہیں اور دعوت کا کام بھی کرتے ہیں۔ ہمارے سوال کے جواب میں مظاہر بہن نے بتایا کہ چودہ ممالک میں ان کے رابطے ہیں۔ ناروے سے ایک بہن کا رابطہ نمبر ہم نے دیا کہ آپ ان کو بھی اپنا نمائندہ بنائیں اور یونین میں شامل کریں۔

اسی اثنا میں ایک پاکستانی بہن جو پاکستان میں ہمارے دروس میں شامل ہوتی تھیں وہ بھی اس دفتر میں آئیں اور بہت اچھی ملاقات ہوئی۔ انھیں انٹرنیٹ کے ذریعے ہماری آمد کا علم ہوا اور تلاش کرتے ہوئے آخری روز ملاقات ہو سکی وہ اس بات پر بہت تاسف کا اظہار کر رہی تھیں کہ انھیں پہلے ہماری آمد کا علم نہ ہو سکا ورنہ وہ یہاں موجود پاکستانی خواتین کو اکٹھا کر کے پروگرام کراتیں۔ ہمیں بھی اس کا رنج ہوا۔ انھوں نے کہا کہ آپ جہاں بھی جائیں اپنی ایمبیسی کو ضرور اطلاع دیا کریں تاکہ وہاں کی پاکستانی کمیونٹی سے آپ کا رابطہ ہو سکے۔ ان کی تجویز اچھی لگی۔

ہم نے ڈاکٹر احسان صاحبہ سے IMWU کے پراجیکٹس کی تفصیل جاننا چاہی۔ انھوں نے بتایا کہ ہم

(۱) سوڈان اور دیگر افریقی ممالک میں زچہ بچہ کی صحت کے حوالے سے طبی امداد فراہم کرتے ہیں اور ان کی صحت پر لیکچرز وغیرہ کا بندوبست کرتے ہیں۔

(۲) ''خوراک سب کے لیے'' Food for All یہ افریقی ممالک کے لیے ایک پروگرام ہے۔

(۳) غیر سودی قرضہ جات کی ایک سکیم چلا رہے ہیں اور خواتین کو چھوٹے کاروبار کے لیے قرضہ دیتے ہیں اور یہ کام سوڈان کے دو اسلامی بینکوں کے ذریعے ہو رہا ہے۔

انھوں نے کہا کہ ہم حضرت خدیجہؓ سے لے کر اب تک ان سے نسبت کے ساتھ تاریخی لحاظ سے فلاحی کام کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے اپنے دیگر کچھ پراجیکٹس کے بارے میں بھی بتایا۔

پاکستان کے کام کے بارے میں انھوں نے سوال کیا تو ہم نے اپنے خدمتی فلاحی اور تعلیمی کام وغیرہ کے بارے میں بھی بتایا اور میں نے کہا کہ میں اللہ سے امید رکھتی ہوں دس سے پندرہ سال کے اندر پاکستان بھی اسلامی انقلاب سے ہمکنار ہوگا ان شاء اللہ۔ اس پر انھوں نے بھی آمین کہا۔

انھوں نے اپنے دفتر کے دیگر عملے سے بھی ملاقات کروائی عفافہ بہن عبدالمالک یونیورسٹی فار اکنامکس میں لیکچرار ہیں اور دفتر میں IMWU کے سٹاف اور دوسری خواتین کے لیے لیکچرز اور تربیت کا کام کرتی ہیں۔ بزنس پلاننگ کراتی ہیں۔

سیلف فائینانس (Self Finance) کی تربیت بھی مختلف جگہوں پر جا کر خواتین کو دیتی ہیں۔ چھوٹے قرضہ جات کے لیے تربیتی پروگرام کراتی ہیں۔ اس پروگرام کی تفصیل بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہم چھوٹے کاروبار چلانے کے لیے اپنے ملک میں اور کچھ دیگر ممالک میں بھی خواتین کو تربیت دیتے ہیں۔ مثلاً پھلوں کو محفوظ کرنا، دستکاری، کپڑے دھونا وغیرہ اس میں شامل ہیں اور یہ کام دوسرے ممالک میں جا کر بھی کرتے ہیں اور دیگر ممالک میں سے خواتین کو یہاں بلا کر بھی سکھاتے ہیں۔ افریقہ میں دیگر ممالک کی اسلامی تحریکیں ان کے ساتھ تعاون کرتی ہیں اور انھیں اپنے ممالک میں بلا کر ان سے تربیت اور تعلیم کا کام لیتے ہیں۔

گفتگو جاری تھی کہ باہر سے پیغام آیا کہ اب ایئرپورٹ جانے کا وقت ہو رہا ہے۔ ہم نے جلدی جلدی دفتر کے بقیہ شعبے دیکھے۔ دفتری امور کے لیے کمپیوٹر ورک اور فائل ورک کے لیے الگ کمرہ مخصوص تھا، لائبریری بھی تھی۔ البتہ دفتر کی حالت فنڈز کی کمی کا اعلان بزبان حال کر رہی تھی۔ شاید اسلامی تحریکوں کا یہ عالمگیر مسئلہ ہے......

دعاؤں کے ساتھ بہنوں سے اجازت چاہی اور ایئرپورٹ کو روانہ ہوئے۔

میزبان جہاز کی سیڑھیوں تک الوداع کہنے آئے۔ ہم نے اسلامی مملکت سوڈان کی فضاؤں کو اپنی نگاہوں سے عقیدت بھرا الوداعی سلام کہا، جہاز میں سوار ہوئے

اور اپنے رب سے دعا کی کہ نیل کے کنارے سے
شروع ہونے والے اس صدی کے روشنی کے سفر کو پایہ
تکمیل تک پہنچا اور دنیا بھر میں اس روشنی کو پھیلانے کا
کام ہم سے لے لے اور پیاسی انسانیت کو اسلام کی
برکتوں اور رحمتوں سے سیراب کردے آمین۔

☆☆☆

انقلاب کی بات کرتے ہو!

ویمن رائٹرز فورم کراچی کا سالانہ کنونشن......جیسے چپکے سے بہار آجائے

ہم ذوق بزم یاراں جمی ہو اور بہت مدت بعد جمی ہو! موضوع بھی نہ صرف دلچسپ ہو بلکہ من پسند ہو تو گھڑیوں کا خیال ہی نہیں آتا اور اگر آتا ہے تو ساعتوں کا حساب کتاب تھوڑا نہیں بہت زیادہ غلط معلوم ہوتا ہے۔

ایسا ہی کچھ احساس لوح و قلم کی مناسبت سے بپا تقریب میں نومبر کی اس مختصر شام در آیا جس کا قلم کار بہنوں کو شدت سے انتظار تھا۔ ہم پر دعوت نامہ موصول ہوتے ہی خوشگوار جذبات غالب آ گئے۔ دھیما دھیما سرور ہر سو چھانے لگا، ہم نفسوں سے روبرو ہونے کا خیال اس قدر جاں فزا تھا کہ ہم ذہن میں گفتگو کا خاکہ ترتیب دیتے رہے، الفاظ چنتے رہے، احساسات کشید کرتے رہے، اجلے ناموں کو سوچتے رہے، ان سے وابستہ تحریریں یاد کرتے رہے اور سر دھنتے رہے۔

اے دل ذرا سنبھل!

ویمن رائٹرز فورم کراچی کی جانب سے سالانہ کنونشن کا خیال اور انعقاد بجا طور پر چپکے سے بہار آ جانے کا عنوان ہو سکتا ہے، صرف کراچی لکھنے سے بات ادھوری رہتی ہے۔ مقتل گاہ کراچی میں جاری غارت گری نے انسانوں کی معاشی، سماجی سرگرمیاں معطل نہیں کی ہیں بلکہ دیدہ ور آنکھوں سے حسین یادیں اور مستقبل کے خواب بھی چھین لیے ہیں۔

آخرش خیالات بُنتے بُنتے وہ دن، وہ لمحے بھی آن پہنچے، دعائیں التجائیں کرتے ہم استقبالیہ سے ملحقہ وسیع وعریض پنڈال میں پہنچے تو خوبصورت سٹیج دیکھ کر جیسے چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ یہ الگ بات ہے کہ چراغوں کی ضرورت ہی نہ تھی۔ ہم سمیت ''قلم کی شہسوار'' بہنیں پھولے نہ سما رہی تھیں۔ لہو روشنائی سے ادب وصحافت کی رزم گاہ آباد رکھنے والی ہستیاں اسی عزت افزائی کی مستحق تھیں۔

بابرکت تلاوت کے بعد مذاکرہ چھڑ گیا جس کا موضوع کسی قیامت سے کم نہیں! تحریر ذریعہ انقلاب...... وہی انقلاب جس کے فراق میں طویل شب کسی طرح کٹ نہیں رہی۔ دیوانوں کا یا فرزانوں کا

بحر بیکراں بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

میری آنکھوں میں خواب ہیں جتنے

ہاں مری جاں فقط تمہارے ہیں

ہم نے اپنے ہاتھ کی تین انگلیوں کی گرفت میں دبے قلم کو بغور دیکھا۔اس سے ثبت ہونے والے الفاظ ایک انقلاب کی نوید دے سکتے ہیں؟ ذہن رسا کا سوال سن کر موئے قلم کھلکھلایا ''من شاہِ جہانم'' ہم نے بے اختیار آنکھیں بند کیں اور قلم کو چوم لیا۔ اپنی مختصر کوششوں پر نظر گئی تو یارا نہ رہا۔دل بری طرح ڈگمگایا۔ اتنے عظیم ہدف کے لیے انگلیوں پر گنی چنی تحریریں؟ چہ پدی چہ پدی کا شوربہ! مگر دوسرے ہی لمحے اپنے اردگرد ساتھیوں کے ہشاش بشاش چہرے دیکھے تو دل نے تقویت پائی۔گرچہ کلام تو درکنا تعارف کی رسم بھی نہ نبھائی گئی۔شرکاء کی بے چین نگاہیں آمنے سامنے بے شمار چہروں پر تھیں۔ہم بھی پہلو بدلتے رہے۔ ہمہ تن گوش ساتھیوں کو جانچتے رہے،مختلف ناموں سے ذہن میں جگمگاتی تحریروں کے آئینے میں ایک ایک چہرہ دل میں اتارتے رہے شناساؤں کو تحفہ مسکراہٹ بڑھاتے رہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ شرکاء کے ناموں کا وقتاً فوقتاً اعلان کیا جاتا رہتا کہ سامعین بھی جان لیتے، اگرچہ کہ درمیان میں رقیب روسیاہ کے فرائض گملے میزیں اور نشستیں انجام دے رہے تھے۔اٹھ کر گلے ملنے کا امکان دور دور تک نہ تھا۔نظروں نظروں میں پیغام رسانی ہوئی۔ انقلاب کے بارے میں سوچتے ہوئے ان گلاب لمحوں کو بسر کیا۔اسٹیج کے تین طرف شرکاء اور درمیان میں وسیع حصہ شاید گوشہ اطفال کے لیے مختص تھا جس کا بورڈ شرارت سے کسی نے اٹھا لیا تھا۔ذہن میں بہار انقلاب کی جان گسل جدوجہد لہراتی تو نظریں ان سراپا انقلاب پھولوں پر ضرور پڑتیں۔ خصوصاً جب تحریر ذریعہ انقلاب کے ضمن میں روسی ناول ''ماں'' کا تذکرہ آیا تو اردگرد کھیلتے، اٹھکھیلیاں کرتے اس ''سپاہ انقلاب'' پر سب کی نظریں اٹھ گئیں۔

سٹیج پر صائمہ اسما (مدیرہ بتول)،ڈاکٹر عزیزہ انجم، حمیرا قریشی، عطیہ عمر اور فرحت طاہر جلوہ افروز تھیں۔کبھی سلطنت قلم کی تاثیر پر اور کبھی امکانات پر بات شروع ہوئی۔کچھ ہوشیاروں نے دعوت نامے میں درج اور اسٹیج پر متمکن افراد کے ناموں کا فرق ڈھونڈ لیا تھا۔دبی دبی سرگوشیاں ابھریں۔اس تناظر میں انہیں گفتگو بھی کہیں بے ربط ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔اس

سے پہلے کہ باقی شرکاء کے کان کھڑے ہوتے ذکر انقلاب کی بساط لپیٹ دی گئی۔ بخدا انقلاب کا موضوع اور اتنا سرسری! کچھ باہم بحث ومباحثہ کی نوبت تو آتی! یہ کیا؟ دل کی دل میں رہ گئی! تشنگی سی تشنگی ہے!! کتنے سوالات ان کی جنبش ابرو کے منتظر رہے۔ سامعین کے لبوں پر اور ذہنوں میں کسک رہ گئی۔ منتظمین اگلی نشست کا وعدہ فردا ہی ٹھہرا لیتے! شرکا سے تجاویز لے لیتے!!

ڈاکٹر عزیزہ قدرے خاموش اور فرحت طاہر بسرعت انقلاب لانے پر بلند آہنگ مصرہیں۔ ادب اور صحافت کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے والے ہکا بکا رہ گئے جب حمیرا قریشی نے ادب کے خصائص کو صحافت کے نقائص اور صحافت کے خصائص کو ادب کے نقائص قرار دیا۔ شرکا کی آنکھیں حیرت سے پھیلنا شروع ہوئیں تو عطیہ عمر نے قارئین پر بھی اصلاح اور تنقید کا بھاری بوجھ ڈال دیا۔ صائمہ اسما سوالات کرنے والوں میں گھر گئیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا ان کے ساتھ ایک بھرپور شام منالی جاتی! مگر منتظمین تو ٹوان ون کیا فوران ون کے قائل ہیں۔ آج کے دور میں جبکہ ذرائع ابلاغ برقی ہوں یا سماجی ہر دور پر live calls یا آن لائن گفتگو کا رواج ہے مگر جہاں ہم تھے وہاں کئی سال پرانی روایت کو یک طرفہ بات چیت کے ذریعے زندہ رکھا گیا۔ لہٰذا ہم اس وقت چونکے جب ہمارے ساتھیوں نے ٹہوکا دے کر سٹیج کی جانب اشارہ کیا۔ شاید ہمارا نام انعام یافتگان میں پکارا گیا۔

اس ذرہ نوازی پر ہم حیران سٹیج پر پہنچے۔ محترمہ رعنا فضل سے خوبصورت تحفہ وصول کیا۔ اور بھی کیا کیا نام تھے۔ کبھی دائیں کبھی بائیں گھومتے۔ خواتین کیک کا ٹکڑا اور چائے تو پہلے ہی نوش کر چکی تھیں۔ الوداعی نظروں سے تمام چہروں کو سارے منظر کے ساتھ اندر جذب کیا اور گھر کا راستہ دیکھا۔

☆☆☆

تجھ سا لاؤں کہاں سے!

امی کی یادوں کے ساتھ کیا کیا یاد آتا چلا جاتا ہے......ایک ہی نسل تو گزری ہے ابھی......اور کتنا کچھ بدل گیا!

کتنے شوق سے کوفتے بنواتی تھیں اور سوجی کا حلوہ......اور ایک طباق میں چار روٹیوں کے ساتھ وہ ایک کٹورے میں کوفتوں کا سالن اور طشتری میں حلوہ رکھ کر اور خوان پوش ڈال کر بڑے بھائی کو دیتی تھیں کہ مسجد میں دے آئے۔ امی کچھ خاص دنوں میں ابا جی کے نام پر خاص طور پر صدقہ کرتیں۔ جس میں ان کا عقیدہ تھا کہ ہمیں اپنے مرحومین کو ضرور یاد رکھنا چاہیے۔ سفید لٹھے کا بن سلا جوڑا اور دوپلّی ٹوپی بھی اسی مسجد کے امام صاحب کو بھیجا کرتی تھیں۔

ابا جی ہمیشہ دوپلّی ٹوپی پہنا کرتے تھے جو امی خود سیا کرتی تھیں، ویسے تو ہم سب کے کپڑے ہمیشہ امی نے اپنے ہاتھ سے سیئے اور اس کو پسند کیا کہ لڑکیوں کو سلائی کڑھائی ضرور آنا چاہیے۔ میرا کبھی کڑھائی کا رجحان نہ بنا۔ باجی خوب مشاق ہوگئیں ہر طرح کے ٹانکے انہوں نے سیکھ لئے۔ پھر ہم سب نے مختلف تقریبات میں انہی کی کڑھائی سے مزّین لباس زیب تن کیے، جس کی سلائی ہمیشہ امی نے کی۔ شاید اس وقت اتنے وسائل بھی نہ ہوتے تھے نہ اسطرح کے رجحان، نہ عورتیں اتنی تساہل پسند کہ بازار گئے اور ہر چیز تیار شدہ لاکر اسی کو کارنامہ سمجھا کہ بہت تھک گئے شاپنگ کرکے...... تب تو ''گھرداری'' اسی کو سمجھا جاتا تھا۔ سب کے گھروں کی یہی اقدار تھیں۔ مہینوں گھر میں سلائیاں اور ٹکائیاں، جب محلے میں کسی کی شادی ہوتی تو گھر گھر دلہن کے کپڑے ٹک رہے ہوتے، کرن اور پیمک لگ رہے ہوتے، اور باجی تو ''گوکھرو'' کے جال بھی بڑی نفاست سے بنا دیتی دلہن کے کپڑوں پر۔ پہلے تو وہ شادی محلے بھر کی شادی ہوتی اور وہ دلہن محلے بھر کی بیٹی اور دلہن ہوتی۔ جس کو ابٹن اور مہندی بھی اتنی ناز سے لگائے جاتے کہ وہ جہیز کے ساتھ ان یادوں اور محبتوں کے بھی کئی سوٹ کیس لیکر جاتی بابل کی دہلیز سے!

امی جان کی یادوں کے ساتھ ساتھ کیا کیا یاد آتا چلا جاتا ہے۔ بس ایک ہی تو نسل گزری ہے ابھی......اور کتنا کچھ بدل گیا! امی کہتی تھیں کہ جو دنیا سے چلا جائے گا اسکی

پسند اور ناپسند کا خیال ہمیشہ رکھنا چاہیے۔ ابا جی کو کھانے میں کوفتے بہت پسند تھے اور سوجی کا حلوہ۔ ویسے تو انہیں شوگر ہوگئی تھی لیکن وہ شوگر کی دواؤں کے ساتھ میٹھا نہ چھوڑتے البتہ چائے میں شکر چھوڑ دی تھی اور سکرین استعمال کرتے تھے۔ امی نے ان کے زیر استعمال وہ سکرین کی ڈبیاں بھی ان کے انتقال کے بعد پھینکی نہ تھیں بلکہ وہ ان میں سوئیاں رکھنے لگیں سوئی دھاگے کی تلہ دانی امی کی خاص حفاظتی اشیا میں ایک تھی جس کو وہ بہت سنبھال کر رکھتیں اور اکثر اپنے تکیے کے ساتھ رکھتیں۔ کیونکہ سوئی دھاگے کی ضرورت اچانک بھی پڑ جاتی ہے اور جس کی دس افراد کی فیملی ہو اور آٹھ ہر عمر کے بچے ہوں وہاں تو اکثر سوئی دھاگے کی ضرورت پاندان کی ضرورت سے بھی بڑھ کر پڑتی ہے۔ گھر کے زیر استعمال کپڑے ہوں یا یونیفارم، بار بار مرمت کے محتاج ہو ہی جاتے ہیں۔ اور وہ مرمت ٹھہری امی کی ذمہ داری۔ جب برسات کا موسم ہوتا تو امی اسی سکرین کی ڈبیہ میں تھوڑا موم ڈال دیتی تھیں تا کہ سوئیوں کو زنگ نہ لگے۔

امی، ابا جی کے انتقال کے بعد شاید ان کی پسند کا زیادہ خیال رکھنے لگی تھیں۔ ویسے زندگی میں بھی رکھا ہی ہوگا شاید ہم اپنی کم سنی کے باعث یاد نہ رکھ پائے ہوں۔ ہاں جو یادیں اب بھی کسی ''آرکائیوز'' کا حصہ ہیں ان میں یہ ضرور محفوظ ہے کہ امی ڈرتی بہت تھیں۔ مثلاً یہ کہ ریڈیو کی آواز ابا جی کے گھر میں داخل ہونے کے بعد مدھم رہے اور ٹی وی تو ابا جی کے سامنے کھل ہی نہ سکتا تھا کیونکہ ابا جی کا کہنا تھا کہ جس گھر میں ناچ گانا ہوتا ہے اس گھر کا رزق تنگ کر دیا جاتا ہے اور رحمت کے فرشتے روٹھ جاتے ہیں۔ اور یہ رحمت کے فرشتوں کا ''روٹھنا'' تو ہمارے شعور کا حصہ بن گیا تھا کہ ابا جی کی غیر موجودگی میں بھی ٹی وی پر کوئی موسیقی کا پروگرام شروع ہوتا تو کسی نہ کسی بہن بھائی کو یاد آ جاتا کہ رحمت کے فرشتے روٹھ جائیں گے اور فوراً بغیر کسی کراہت کے کوئی بھی اٹھ کر ٹی وی کا سوئچ بند کر دیتا۔ یہ بھی خدا کی رحمت ہی تھی کہ اس وقت ٹی وی پر کچھ دیکھنے کے لیے 5 بجے کا انتظار کیا جاتا تھا۔ اور کبھی جو گھر کی گھڑی خراب ہو جاتی تو بار بار ٹی وی کھول کر بھائی دیکھتا اور ٹی وی پر جھائیاں دیکھ کر فوراً بند کر دیتا کہ ''اوہ ابھی پانچ نہیں بجے!'' بہت اہتمام سے قرات اور ترانے کے ساتھ ٹی وی کی نشریات کا آغاز ہوتا تو گھر والوں کے علاوہ محلے کے چار چھ بچے بھی ٹی وی کے سامنے موجود ہوتے جن کو کارٹون دیکھنے کا شوق ہوتا کیونکہ اس وقت محلے کے ہر گھر

میں ٹی وی نہ ہوتا تھا۔ اوراس وقت تو گھر میں ٹی وی کا ہونا بھی ''اسٹیٹس'' کی نشانیوں میں سمجھا جاتا تھا۔ رات کو آٹھ بجے آس پڑوس کی بیگمات اورلڑکیاں بالیاں بھی کسی گھر میں اکٹھی ہوجاتیں کبھی ''نیلام گھر'' ''انکل عرفی'' اور کبھی ''تنہائیاں'' دیکھنے کے لیے۔

امی کو ٹی وی سے کبھی رغبت نہ تھی۔ ان کو کتابوں سے بہت لگاؤ تھا۔ اول تو گھر داری اس وقت اتنی مہلت ہی نہ دیتی تھی جب مصالحہ سل پر پستا تھا اور کپڑے ہاتھ اور ڈنڈوں کی مدد سے دھوئے جاتے تھے۔ وقت بے وقت پر مہمانوں کی آمد پر بچوں کو بیکری نہ دوڑایا جاتا تھا بلکہ گھر میں دستیاب کچن کی اشیا سے کبھی سویاں کبھی پکوڑے کبھی حلوہ، کبھی دہی کی کوئی چیز بنا کر مہمانوں کو پیش کی جاتی۔ کوک اور پیپسی اس وقت لوازمات کے آئٹم شمار نہ کیے جاتے تھے نہ پیزا اور برگر اس وقت ''in'' تھا تواضع کی فہرست میں۔ کتنی سادگی تھی اور کتنا خلوص۔ جس گھر کا محلے میں دروازہ بجایا اندر سے کسی ''خالہ'' کی آواز آتی تھی۔ اور اچھے برے وقت میں خالائیں بھی آجاتی تھیں۔ بلکہ بے وقت مہمانوں کی آمد کی صورت میں تو دائیں بائیں کے گھروں سے بھی مہمانوں کی تواضع کے لیے کچھ نہ کچھ آجاتا تھا، اور ضد میں آکر کسی بچے نے کچھ کھانے سے انکار کر دیا تو اڑوس پڑوس کے گھروں سے بھی درآمد و برآمد کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا۔ اس وقت یہ چیزیں ''خاندانی وقار'' کے منافی خیال نہ کی جاتی تھیں۔ اور وہ ''وقار'' بھی ناک پر بیٹھی مکھی یا کپڑوں پر لگی دھول کے مترادف نہ تھے جو ایک ہلکی سی جنبش کے محتاج ہوں۔ اب تو سگی خالاؤں سے بھی بچے وہ قرب محسوس نہیں کرتے جو ہم محلے کی خالاؤں سے محسوس کرتے تھے۔ وقت بدلتے بہت کچھ بدلتا چلا گیا۔ اپنے بچوں کو اپنے بچپن کی باتیں بتائیں تو وہ یوں منہ کھول کر سنتے ہیں جیسے قبل از مسیح کے واقعات ہوں۔

ہاں امی......ابا جی کے صدقے کے لیے کبھی کبھی گڑ کے چاول بھی بہت اہتمام سے باجی سے بنواتی تھیں کہ ابا جی کی سردیوں کی مرغوب غذا تھی۔ اور اسی اہتمام سے وہ گڑ کی چائے بنوایا کرتے تھے۔ بلکہ چائے تو وہ خود بناتے تھے صبح کی، اس میں ادرک اور دارچینی ضرور شامل کرتے کہ بچے بہت سی بیماریوں سے بچے رہیں گے۔

جب جب امی باجرے کی روٹی کا ملیدہ بناتیں ابا جی کو بہت یاد کرتیں کہ ''تمہارے باپ کو بہت پسند تھا یہ'' اور پڑوس کے دائیں بائیں کے گھروں میں بھی ضرور بھجواتیں۔ کبھی ابا جی کے نام سے کوئی خاص چیز بنا

کر محلے کے ''دادا ابا'' کو بھجواتیں جو بہت ضعیف ہو گئے تھے، اکثر گھر کے باہر تھڑے پر بیٹھے رہتے اور سر گھٹنوں میں دیئے جانے کیا سوچتے رہتے تھے۔ ہم میں سے اکثر محلے کے بچوں نے ان سے قرآن ختم کیا تھا اس لیے محلے بھر میں ان کی خاص تکریم تھی۔ اور جب ان کا انتقال ہوا تھا تو محلے بھر میں یوں سوگ تھا جیسے ان کا جنازہ ہر گھر سے اٹھا ہو۔ جب خوشیاں بھی سانجھی تھیں اور دکھ بھی۔ جب خاندان یوں کنبوں میں محدود نہ ہوئے تھے۔

ایک برس اور بیت گیا ہے امی کو رخصت ہوئے...... کل سے خواہش ہو رہی ہے ان کے نام کا صدقہ دوں۔ بار بار خیال آ رہا ہے کہ وہ صدقہ دیتے ہوئے ابا جی مرحوم کی خواہشوں اور پسند کو کتنا مدنظر رکھتی تھیں۔ یہ ان کے عقیدے میں شامل تھا کہ روح زیادہ خوش ہو گی اگر اس کی پسند و ناپسند کا اہتمام کیا جائے۔

قلم یہاں آ کر رک گیا اور سوچ ٹھہر سی گئی کہ امی کے نام پر کیا صدقہ دوں؟ میں نے ان کو نیا کپڑا خریدتے کبھی دیکھا ہی نہیں اپنی ذات کے لیے۔ وہ تو عید بقر عید پر بھی نئے کپڑوں سے بے نیاز ہوتی تھیں۔ عید کی خریداری میں ان کی ذات کے لیے تو کبھی بھی کچھ نہ آتا تھا۔ جب ہم پوچھتے امی آپ نے کیوں نہیں بنائے کپڑے تو کہتیں ''عید تو بچوں کی ہوتی ہے۔'' وہ ریشمی کپڑے پہنتی تھیں اور ریشمی کپڑے تو پرانے ہی نہیں ہوتے۔

اب میں ان کی پسند کے پرانے کپڑے کہاں سے لاؤں۔ اور کون لے گا پرانے کپڑے۔ اب تو ماسیوں کے پاس بھی کپڑوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ اور کپڑے بھی وہ عموماً میل خورے رنگوں کے پہنتی تھیں کہ دن بھر کے سارے کام تو خود اپنے ہاتھوں سے کرتی تھیں روز نہانے دھونے کی فرصت ملنا تو عبث تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں انہیں کبھی اپنے کپڑوں پر استری بھی کرتے نہ دیکھا تھا کہ ان کے نزدیک یہ فضول خرچی اور تعیّشات کے زمرے میں آتا تھا۔ اب پرانے، ریشمی کپڑے...... امی جو ہمیشہ زیب تن کیے رہیں وہ کہاں سے لاؤں خیرات کرنے کے لیے...... کہ نیا کپڑا دیکھ کر وہ کہتیں ''اس کے مستحق تو کوئی اور ہیں۔''

کھانے کے وقت کا انتظار کرنا تو بہت مشکل ہوتا تھا ان کے لیے۔ وہ دن میں دو بار کھانا کھاتیں اور جب بھوک لگتی کھا لیتی تھیں۔ اہتمام تو ہمارے لیے ہوتا۔ ان کو تو بس بھوک بھر کچھ بھی دستیاب ہو جاتا۔ عموماً رات کی روٹی نکالی فریج میں رات کا بچا کچھ ہے تو خیر ورنہ...... روٹی پلیٹ پر رکھی، پیاز کاٹی، ہری مرچ، نمک چھڑکا اور اللہ اللہ

خیر صلاً۔ میں نے بار ہا انہیں سرخ مرچ اور نمک کو سالن کے طور پر کھاتے دیکھا تھا۔ کریلے پسند کرتی تھیں خشک کر کے رکھ لیتی تھیں ایک دھاگے کی لڑی میں پرو کر خشک کر لیتی تھیں کریلے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو۔ بس وہ ہفتوں زیر استعمال رہتے۔ اور ان کے ''لنچ'' کی بھی زینت ہوتے اور ڈنر کی بھی۔ دماغ پر بار بار زور ڈال رہی ہوں کہ ان کی برسی پر ان کی پسند کا کھانا بنا کر خیرات کروں۔ مگر بے بس ہوگئی ہوں۔ سوچتے سوچتے۔ قلم رک گیا ہے یہاں آ کر اور ذہن ماؤف۔ امی آپ کی پسند، آپ کے طرز زندگی نے کتنا مشکل میں ڈال دیا مجھے۔ آپ نے تو ابا جی کا حق مرنے کے بعد بھی خوب نبھایا۔ اب آپ کی پسند کی خیرات کون لے گا اور دینے کا حوصلہ بھی کس میں ہے!

آج تو بچے کھانا پسند نہ آنے یا دیر ہو جانے پر پیزا یا برگر خرید لاتے ہیں لپک کر۔ امی بتایئے آج اگر آپ کے نام پر اپنے بچوں کی پسند کی خیرات کر دوں تو آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہوں گی ناں؟

آپ خود کے لیے نئے کپڑے نہیں بناتی تھیں کہ حساب دینا ہوگا نئے کپڑے کا...... کوئی نیا جوڑا کبھی بنایا بھی تو رمضان میں پہنتی تھیں ان کا خیال تھا کہ رمضان میں کی گئی غلطیوں کو اللہ رحمت سے ڈھانپ لے گا۔ بس آج مجھے نیا جوڑا خرید نے دیں۔ اس کا حساب مجھے یقین ہے کہ آپ کے کھاتے میں نہیں جائیگا...... میری پیاری ماں!!

☆☆☆

پانی ضائع نہ کریں

سورۂ رحمٰن میں ۳۱ بار اس آیت کو دہرایا گیا ہے کہ ''تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے'' ہماری نعوذ باللہ ایسی جرأت کہاں کہ اس مالک کی کسی نعمت کا انکار کریں یا اُس کو جھٹلائیں۔ ویسے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت انسان کو لاکھوں کروڑوں نعمتوں سے نوازا ہے لیکن ہوا کے بعد پانی ایسی نعمت ہے کہ جس کے بغیر کچھ گھنٹے تو گزارے جا سکتے ہیں لیکن چند روز نہیں اور ہوا کے بغیر تو چند منٹ بھی نہیں جو ہمیں ہر وقت اور ہر جگہ بالکل مفت دستیاب ہوتی ہے اور اسے ہم کسی نعمت میں شمار ہی نہیں کرتے۔

بات ہو رہی تھی پانی کی اور جتنی اس نعمت کی ناقدری اور ضیاع ہمارے ملک خداداد میں ہوتا ہے شاید دنیا کے کسی اور خطے میں نہ ہو۔ ہم اپنے تین دریاؤں سے ویسے ہی ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ راوی اب بہتا نہیں بلکہ ایک گندے مگرمچھ کی طرح لیٹا رہتا ہے۔ اس ''گندے نالے'' میں ہندوستان کی صنعتوں کا اور ہماری اپنی فیکٹریوں کا کیمیکل اخراج وافر مقدار میں ڈالا جاتا ہے۔ صرف برسات کے موسم میں اس میں پانی نظر آتا ہے جب ہمارے دشمن کو اس پانی کی ضرورت نہ ہو۔ ستلج اور چناب میں بھی پانی صرف سیلابی ریلے کی صورت میں آتا ہے۔ سندھ اور جہلم میں پانی کی مقدار بہت کم ہو چکی ہے کیونکہ جب ہم ڈیم نہیں بنائیں گے تو کوئی اور تو ضرور بنائے گا اور وہ دھڑا دھڑ بنا رہا ہے نہ صرف بنا رہا ہے بلکہ ہمارا منہ بھی چڑا رہا ہے کہ شاباش خوب لڑو آپس میں، خوب اپنا پیسہ ضائع کرو رینٹل پاور پر اور اس وقت تک لڑو جب تک ہم تمھارے ملک کو ایتھوپیا میں نہ بدل دیں (خدانخواستہ)۔

لیکن اللہ بھی ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں اس کے پیچھے کسی کا بھی ہاتھ ہو ہمیں عادت ہو چکی ہے ہر بات کا الزام امریکہ اور ہندوستان کو دینے کی۔ اگر ہم خود اپنے ملک کے لیے کچھ کرنا نہ چاہیں تو کسی کو کیا پڑی ہے کہ وہ ہماری مدد کرے۔ گرمیوں کے موسم میں جب بہت دیر تک بارش نہ ہو تو اکثر یہ سننے کو

ملتا ہے کہ تربیلا میں چھ دن کا پانی رہ گیا۔ منگلا میں ساتِ دن کا، اسلام آباد راول ڈیم میں تین دن کا پانی رہ گیا۔ وہ تو اللہ ہی ہے کہ اس کی رحمت برس پڑتی ہے اور وہ ہمیں پیاسا مرنے سے بچالیتا ہے۔

ایک طرف تو پانی کا یہ حال ہے اور دوسری طرف ہماری بے حسی ملاحظہ کریں۔ہم اپنے گھروں سے شروع کریں تو دیکھیں کہ پانی کی ٹنکی overflow کر رہی ہے لیکن ہمیں توفیق نہیں ہوتی کہ اس میں نیا float Valve لگوالیں۔کوئی نلکا خراب ہے تو ٹپ ٹپ پانی بہتا ہے ہمیں پروا نہیں ہوتی اپنے گھر کے صحن کو، گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ کو، گیٹ کے باہر کی جگہ کو روزانہ خوب خوب دھوتے ہیں یہ سوچے سمجھے بغیر کہ یہ میٹھا پانی ہے۔ترقی یافتہ مما لک میں تو سیوریج کے پانی کو treatment کر کے باتھ روم کے فلش اور پودوں کو دینے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔گاڑیوں کو بھی بڑی دھوم دھام سے ڈرائیور سے روزانہ دھلوایا جاتا ہے اور اس دوران پائپ فل چلتا رہتا ہے۔حالانکہ گیلے کپڑے سے بھی گاڑی صاف ہوسکتی ہے اور بالٹی میں پانی ڈال کر بھی یہ کام کیا جا سکتا ہے۔اپنے Drive way کو بھی سوکھے جھاڑو سے صاف کیا جاسکتا ہے۔اتنی دھلائی کی کیا ضرورت ہے اس پر ہمیں آٹا تو نہیں گوندھنا ہوتا کہ روز دھلائی کی جائے! ملازمین جھاڑو سے مٹی صاف کرنے کی بجائے پانی کی زوردار دھار سے یہ کام لے رہے ہوتے ہیں۔ یہ نظارہ اس قدر تکلیف دہ ہے کہ حد نہیں۔

دانت صاف کرنے باتھ روم گئے ہیں۔کہاں لکھا ہے کہ نلکا چھوڑ دیں اور بہتے پانی کے میوزک پر اپنے دانت برش کریں۔کئی لوگوں کو تو میں نے یہاں تک دیکھا ہے کہ منہ کھول کر ساتھ ساتھ شیشہ دیکھ رہے ہیں اور ساتھ دانت صاف ہو رہے ہیں خدا کے بندے نلکا تو بند کردو۔کیا بہتے پانی کا اور برش کی حرکت کا آپس میں کوئی رشتہ ہے جو نلکا بند کرنے سے ٹوٹ جائے گا؟ آپ یقین کیجیے میں نے چند سال پہلے BBC کا ایک پروگرام دیکھا تھا وہ اپنے بچوں کو احتیاط سے پانی استعمال کرنا سکھا رہے تھے کہ پلاسٹک کا ایک جگ بھر کر رکھ لیں اس سے برش کریں اور منہ دھوئیں اور پانی ضائع نہ کریں۔ یہ اُس ملک کی منصوبہ بندی ہے جہاں بارشیں ہر وقت ہوتی ہیں۔چاروں طرف پانی ہے، ڈیمز کی کمی نہیں۔ وہ بچپن سے بچوں کی تربیت میں یہ بات ڈال دیتے ہیں کہ پانی ضائع نہیں کرنا۔اسی لیے جب اُن ملکوں میں آپ جاتے ہیں تو عوامی جگہوں پر ان کے غسل خانے گیلے نظر نہیں آتے، صاف شفاف نظر آتے ہیں اور ہماری Public Place بھی آپ ملاحظہ کر چکے

ہوں گے کہ غسل خانوں کے باہر سے ہی فرش گیلا نظر آنا شروع ہو جاتا ہے۔

ہم غسل خانہ اور باورچی خانہ دھونے میں کس قدر پانی ضائع کرتے ہیں باورچی خانہ تو کبھی کبھار دھونا کافی ہے۔اگر پوچا صحیح لگایا جاتا ہے تو آج کل جو ماڈرن غسل خانے بن رہے ہیں ان میں واش بیسن اور کموڈ یا W.C کو دھونا تو ناگزیر ہے مگر دیواروں کی ٹائلز پر اور فرش پر گیلا پرانا تولیہ پھیرا جا سکتا ہے گھروں میں وہ تولیے جو پرانے ہو جاتے ہیں یا پرانے سویٹر جن میں سوراخ ہو جائیں یا وہ کسی کو دینے کے قابل نہ ہوں وہ بھی فرش اور ٹائلز کی صفائی میں استعمال ہو سکتے ہیں۔

امریکہ جیسے ملک میں جہاں چاروں طرف پانی ہے سمندروں جتنی بڑی بڑی میٹھے پانی کی جھیلیں ہیں۔پانی کی فراوانی ہے۔وہاں پر امیر سے امیر لوگ بھی اپنے گھروں کو بڑے بڑے ٹشو پیپرز کو گیلا کر کے یا پرانے بڑے بڑے تولیے دھو کر نچوڑ کر اپنے کچن اور باتھ رومز صاف کرتے ہیں (میں چشم دید گواہ ہوں)۔

بچوں کے علاوہ اپنے ملازمین خصوصاً ڈرائیور، برتن دھونے اور صفائی کرنے پر مامور ملازمین کو ہر روز یہ بات سمجھائیں اور نگرانی کریں کہ وہ اپنے کام کے دوران پانی کم سے کم استعمال کریں۔

وہ خاندان جو بہت بڑے بڑے ہیں (اللہ کی رحمت سے) یا مشترکہ خاندانی نظام ہے اور بہت زیادہ برتنوں کی صفائی کا مسئلہ ہوتا ہے وہاں بھی اگر طریقے سے چلا جائے تو پانی بچایا جا سکتا ہے۔دو ٹب لے لیں، ایک ٹب میں برتنوں کی صفائی والا ڈٹرجنٹ یا لیکوڈ گھول لیں اس میں برتن ڈال ڈال کر نکالتی جائیں۔دوسرے ٹب کے پانی یا نلکے سے برتنوں کو دھوتی جائیں لیکن نلکا کھول کر بھول نہ جائیں اور اگر نلکا بند کرنا بھول جائیں تو ذرا ذہن میں ان عورتوں اور بچوں کی لمبی لائنیں لائیں جو پانی کے انتظار میں کئی کئی گھنٹے کھڑے رہتے ہیں یا دور دراز علاقوں سے سروں پر گھڑے بھر بھر کر لاتے ہیں۔سخت گرمی اور سردی میں، اور ساتھ یہ بھی دماغ کے کسی گوشے میں بسا لیں کہ یہ جو پانی ہم استعمال کر رہے ہیں اس کا حساب بھی دینا ہے حساب لینے والے کو ایک دن۔

اللھم حاسبنی حساباً یسیرا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنی نعمتوں کی ناقدری اور ناشکری سے بچائے اور بے حسی سے بھی۔ آمین

☆☆☆

بات کا اثر

(ثناء عزیز، جھنگ)

ہر جگہ جہاں کوئی بھی انسان ہو خصوصاً لڑکیاں، وہاں بے شمار باتیں ہوتی ہیں۔ بات سے بات نکلتی ہے اور ہم باتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ صرف تین حروف ہیں اس لفظ کے ب، ا، ت، مگر کبھی یہ حروف اپنے اندر بہت وزن رکھتے ہیں اور کبھی یہ بالکل بے وزن ہو جاتے ہیں۔ کبھی کسی کی کوئی بات ہمیں خوش کر دیتی ہے تو کوئی بات ناخوش کر دیتی ہے۔ کبھی کسی کی بات سے ہم ناراض ہو جاتے ہیں تو کبھی ہماری کوئی بات کسی کو ناراض کر دیتی ہے۔ دو افراد جو بالکل اجنبی ہوں، دو چار باتیں کر لینے کے بعد ایک دوسرے سے مانوس ہو جاتے ہیں۔

باتیں کرنا ہمیں بہت اچھا عمل لگتا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ زیادہ دیر ہم خاموش نہیں رہ سکتے مگر کبھی ہماری کوئی بات ہمیں اللہ یا کسی انسان کی نظروں سے گرا دیتی ہے جیسے شیطان صرف ایک بات کی وجہ سے رب کائنات کی نظروں سے ہمیشہ کے لیے گر گیا اور حدیث میں ارشاد ہوتا ہے۔ رسولؐ خدا نے ارشاد فرمایا ’’انسان ایسا کلمہ کہہ جاتا ہے، اس کے نقصان کو نہیں سمجھتا اور اس کی بنا پر دوزخ میں اس دوری سے زیادہ دور جا گرتا ہے جو مشرق اور مغرب کے درمیان ہے۔‘‘ (مسلم)

لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ اگر ہم بات نہ کریں تو ہمارے نظریات، افکار، خیالات واحساسات دوسروں تک نہیں پہنچ پاتے اور اگر باتیں کریں تو بہت سارے نامناسب الفاظ بول جاتے ہیں۔ کسی کو برا بھلا کہہ جاتے ہیں۔ چغلی کھا جاتے ہیں، جھوٹ بول جاتے ہیں۔ غیبت کر جاتے ہیں تو پھر ایسا کیا کریں کہ ہم باتیں بھی کریں مگر نہ کسی انسان کی نظروں میں گریں اور نہ ہی اللہ کی نظروں میں؟ یہی سوال میں نے قرآن وحدیث، علماء ومفکرین سے کیا۔ علماء ومفکرین نے کہا کہ کسی کی حوصلہ افزائی میں دو چار الفاظ کہنا، حق بات کہنا، کسی کا

دکھ درد بانٹنا بھی بہترین کام ہے۔

سیرت النبیؐ سے مجھے جواب ملا کہ اچھی بات کہنا بھی صدقہ ہے اور سلطان جابر کے سامنے کلمہ حق کہنا افضل ترین جہاد ہے۔قرآن پاک سے جواب ملا۔

ہم روزانہ بےشمار باتیں کرتے ہیں۔اگر ہدف یہ بنا لیا جائے کہ ہماری باتیں اس معیار کے مطابق رہیں تو ہوسکتا ہے کہ ہماری یہی باتیں آخرت میں ہمارے لیے جہنم سے رہائی کا وسیلہ بن جائیں۔

☆☆☆

میرے قلم کو جو زنگ لگا ہے!

میری ''تروتازہ'' کاوش بے حد عزیز چمن بتول کے نام

حمیرا ثاقب-فیصل آباد

اپنے چھٹے بچے کی تخلیق، پیدائش اور ابتدائی پرورش کے تکلیف دہ اور انتہائی صبر آزما مراحل سے کسی قدر فراغت پائی تو سب سے پہلے یہی سوچا کہ ہائے مولا! یہ ہاتھ تو ادبی تخلیق کے عمل کو بھول سے گئے ہیں۔ذرا ان کو رواں کر...... میں تو سودا سلف کی لسٹ بنانے اور پھر اس کو متناسب بنانے کے علاوہ قلم تھامنے بھول ہی گئی ہوں ...... اور یہ ''لسٹ سازی'' کبھی کبھار اتنی تکلیف دہ ہوتی ہے کہ دردِ سر آ دھمکتا ہے تو پھر لسٹ بنانے سے بھی معذور ہو جاتی ہوں۔

گزشتہ چند دنوں سے اپنی بے حد عزیز ''سبز فائل'' کا مطالعہ کر رہی ہوں۔اس میں میں نے تمام تر تعلیمی اسناد، شائع شدہ افسانے اور تحریریں اور چند نامکمل تحریریں لگا رکھی ہیں اور یہی ''ثواب حاصل سوچ'' ذہن میں ہے کہ کسی ''فرصت'' کے وقت میں مکمل کر کے بتول کو ارسال کروں گی۔مگر ''ثواب'' کا ڈھیر لگ جانے کے باوجود وہ فرصت کا وقت مل ہی نہیں رہا۔

تو سوچا یہ فرصت تو ملنے کا نام ہی نہیں لے رہی اور رہی سہی مت بھی ماری جا رہی ہے تو چلو بی بی حمیرا! فرصت خود نکال لو...... کیا ہوا جو ہانڈی لیٹ بن جائے یا گھر کی عمومی صفائی ستھرائی Pending ہو جائے ...... اس قلم کے زنگ کو آج صفائی کے عمل سے گزار ہی لوں۔جیسے دلوں کے زنگ کو دور کرنے کا طریقہ آقائے کریمؐ نے موت کو کثرت سے یاد کرنا اور قرآن پاک کی تلاوت بتایا ہے۔اسی طرح قلم کا زنگ صرف اُسی صورت دور ہو گا جب اُس کو استعمال کیا جائے اور چلایا جائے......

اور تاثراتی تحریر کا یہ بڑا فائدہ بھی ہو گا کہ میری ساتھی قلم کار بہنیں جب یہ پڑھیں گی کہ ان کی ایک قلم کار بہن دوبارہ میدانِ تحریر و تخلیق میں اترنے کو بے تاب ہے اور ''غمِ روزگار'' میں پھنسی ہوئی ہے تو وہ دعا کریں گی کہ یارب! ہماری اس قلم کار بہن کے ہاتھ اور قلم کو رواں کر دے، اس کو ہمت، طاقت، صحت اور فرصت عطا کر تاکہ یہ واپس اپنے ادبی محاذ پہ ڈٹ جائے اور اس کا قلم رواں ہو کر بہتر سے بہتر کی طرف گامزن ہو جائے......تو اللہ کی رحمت جوش میں آ جائے گی (کیونکہ وہ اپنے بندوں کی دوسروں کے حق میں کی گئی دعائیں زیادہ قبول فرماتا ہے) اور وہ میرے قلم کا زنگ توڑنے میں میری مدد فرمائے گا۔ان شاءاللہ۔

تو پھر اے بارِ الٰہ! میری مدد اور استعانت فرما۔ میں اپنی ادبی بے کسی اور بے بسی کی فریاد صرف تیرے حضور کرتی ہوں، تو میرا حامی اور مددگار ہو جا تاکہ روزِ محشر میرے نامۂ اعمال میں یہ درج ہو کہ میں لکھ سکتی تھی اور میں نے لکھا۔آمین ثم آمین

☆☆☆

آہ! پروفیسر غفور احمد

(طاہرہ کامران۔کراچی)

''جی بیٹا! میں عبدالغفور احمد بات کر رہا ہوں۔'' اکثر یہ الفاظ بچپن میں میری سماعت سے ٹکرایا کرتے تھے۔ دھیمے لہجے اور شفقت بھری آواز میں الفاظ کے موتی پرو کر دلوں پر راج کرنے والے ہمارے پیارے عبدالغفور احمد صاحب اب اس دارفانی سے کوچ کر چکے...... ہمیشہ سفید لباس میں نظر آنے والے اپنے آخری سفر پر روانہ ہوتے ہوئے سب کو سوگوار کر گئے۔ مجھے ان میں اپنے والد کی سی شفقت محسوس ہوتی تھی لہٰذا ان کا آخری دیدار بھی اپنا فرض سمجھ کر کیا۔ان کا پرسکون اور پرنور چہرہ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ مردِ مومن نے حق ادا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

گلفشاں میں واقع پروفیسر غفور احمد کے گھر کا دروازہ شاید ہی کبھی کسی نے بند دیکھا ہو۔ ہر وقت لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ اور ہر آنے والے کا استقبال نہایت خوشدلی سے کیا جاتا تھا۔گھر سادگی کا نمونہ تھا۔یہی سادگی پروفیسر صاحب کی شخصیت کا بھی حصہ تھی۔آپ کی اہلیہ بھی نہایت باوقار اور مخلص خاتون تھیں۔انہوں نے ہر موقع پر اپنے شوہر کا ساتھ دیا۔گھر کا ایک حصہ تو جیسے جماعت اسلامی کے پروگراموں کے لیے ہی وقف تھا۔ ہر وقت تنبو لگا نظر آتا۔ الیکشن

کے دنوں میں تو غفور صاحب کا گھر نہایت چہل پہل کا منظر پیش کرتا۔خواتین کے ہر پروگرام کا محور غفور صاحب کا گھر ہوتا۔

کراچی کی لسانی تنظیم نے غفور صاحب کو خاص طور پر نشانہ بنایا۔ ان کے خلاف درودیوار نعروں سے رنگین رہتے اسی طرح گھر پر فون کالز کر کے بھی ستایا جاتا۔لیکن غفور صاحب نام ہی کے غفور نہیں تھے،انہوں نے تمام آزمائشوں کو نہایت صبر کے ساتھ برداشت کیا۔

میری والدہ منور صاحبہ کے انتقال پر گھر بھی تشریف لائے اور نماز جنازہ میں بھی شریک ہوئے۔غم ان کے چہرے پر عیاں تھا۔نہایت رفیق القلب انسان تھے۔ ہر فرد کا غم انہیں اپنا غم محسوس ہوتا تھا۔

آپ کی خدمات کا اعتراف دوست تو کیا دشمن بھی کرتے ہیں۔اتنے تعلیم یافتہ، قابل اور نامور ہونے کے باوجود عجز وانکسار ان کی ذات کا خاصہ رہا۔ اور یہ خصوصیت یقیناً اللہ کے پسندیدہ بندوں کی ذات کا ہی حصہ ہوا کرتی ہے۔اپنی زندگی ہی میں وراثت کی تقسیم کے فریضے سے سبکدوش ہو گئے اور گلشن اقبال کے چھوٹے گھر میں منتقل ہو گئے تھے۔

کہنہ سالی کے باوجود اجتماعات میں شرکت لازمی ہوتی تھی۔ دھیمی آواز میں خطاب فرماتے تو دل یہ کہتا کہ''اہل ایمان ایسے ہوتے ہیں!''

تمام طبقہ فکر سے تعلق رکھنے والوں کے لیے غفور صاحب کی زندگی ایک پیغام اور نمونہ رہی ہے۔

ہم محروم ہوتے جا رہے ہیں ایسے افراد سے جو اپنے ملک کے سر کا تاج تھے جو سرمایہ تھے،اس ملک کی عزت میں اضافے کا باعث تھے۔ بلاشبہ غفور صاحب کی رحلت ایک عظیم نقصان ہے۔ پاکستان کی سیاست میں غفور صاحب کی خدمات ہمیشہ جگمگاتی رہیں گی۔

☆☆☆

عورت کے نام

(فرح ثناءاللہ۔کراچی)

عورت تو کتنی پاگل ہے
من میں سپنے بنتی ہے
اک اک خواب کو چُنتی ہے
سپنے تتلی اور پھولوں کے
بادل اور چاند ستاروں کے
ہنسی،سکھ چین، بہاروں کے
پھر جاگتی راتوں اور مصروف دنوں کے ساتھ

تھکن سے چور بدن، شکستہ روح لیے
ان خوابوں میں دھنک کے رنگ سجاتی ہے
ان کو تعبیر بناتی ہے
مان، محبت، نام اور عزت کی چاہت میں
جانے کیا کیا کرتی ہے
لیکن پھر اس کو کہا یہ جاتا ہے
آخر تم کیا کرتی ہو؟
آخر تم نے کیا ہی کیا ہے؟
تب اپنی خالی جھولی کو وہ
خالی آنکھوں سے تکتی ہے
اور کہتی ہے
تُو سچ مچ کتنی پاگل ہے!!

☆☆☆

سراب

(طوبیٰ احسن۔ کراچی)

14 فروری ہے آج
یاد ہے اب تک مجھے
پچھلے سال اسی دن ہی تو
بڑھی تھی میری طرف محبت
ہاتھوں میں تھے سرخ گلاب
میں نے بڑھا دیا تھا ہاتھ
اور کیا تھا اسے قبول
کیسی خوشی پائی تھی میں نے
جو اس سے پہلے نہ ملی تھی
سب کچھ اپنا کیا نچھاور
آج تہی دامن ہوں کیوں میں
میری ان آنکھوں نے دیکھا
بدل لیا جب کسی نے رستہ
14 فروری ہے آج
ہاتھ میں پھر ہیں سرخ گلاب
آج وہ میرے لیے نہیں ہیں
کتنی اکیلی کھڑی ہوئی ہوں
تنہا اور اداس!

☆☆☆

محشرِ خیال

خورشید بیگم۔ٹوبہ ٹیک سنگھ

جنوری کا چمنِ بتول پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ پہلا مضمون ’’فتنے اور آزمائش‘‘ گویا کہ میرے دل کی آواز ہے۔محترمہ فریدہ خالد نے ان حالات میں کرنے کے جو کام بتائے ہیں اگر ہم مسلمان ان پر عمل کریں تو دنیا جنت کا نمونہ نظر آئے۔

ڈاکٹر مقبول شاہد کا مضمون ’’دعا‘‘ پُر اثر اور پر مغز ہے۔ یقیناً مسلمان کے لیے دعا ایک بہت بڑا ہتھیار ہے۔محترمہ قانتہ رابعہ اپنی پُر غم کہانیوں سے پڑھنے والوں کو غمگین کر دیتی ہیں۔ پھر یکدم ہی آس بندھاتے ہوئے غیر محسوس انداز میں نصیحت کر دیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنا مشن جاری رکھنے کی توفیق و ہمت عطا فرمائے(آمین)

طوبیٰ احسن کی کہانی ’’یہ کیسی راہیں‘‘ اپنے اندر آج کل کی جذباتی لڑکیوں کے لیے بہترین درس رکھتی ہے۔کاش وہ بچیاں اسے پڑھیں جو سوچے سمجھے بغیر انجانی راہوں پر چل پڑتی ہیں۔

افشاح نوید صاحبہ کی کہانی ’’کتابیں اپنے آبا کی‘‘ ہمارے معاشرے کی ایک تلخ حقیقت کو الفاظ دے رہی ہے۔ واقعی اس سٹلائیٹ کے دور میں کسی کے پاس کتابوں کے مطالعے کا وقت نہیں۔ روپے پیسے کے لیے تو لوگوں کو باہم لڑتے دیکھا ہے، کتابیں تو کسی کی اولاد کے درمیان باعثِ نزاع نہیں ہوئیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہیرے کی قدر جوہری ہی جانتا ہے، جیسے مریم جمیلہ صاحبہ کی بہوان کے بارے میں لکھتی ہیں کہ انہیں اپنی کتابیں کسی زیور سے کم نہیں تھیں۔اس دور میں قابلِ رشک ہیں وہ خاتون کہ ان کی سوتیلی اولاد بھی ان کی تعریف کرتے نہیں تھکتی۔ان کے بچوں سے میری گزارش ہے کہ ان کی زندگی کے مختلف گوشے ماہنامہ ’’بتول‘‘ کی نذر کرتے رہیں تاکہ سب پڑھنے والے اس سے مستفید ہوسکیں۔

سیدہ فاطمہ گیلانی۔ساہیوال

جنوری کا رسالہ ماشاءاللہ ہر لحاظ سے اپنے معیار پر پورا اترا ہے۔اداریے سے لے کر آخر تک ماشاءاللہ

نظر بد دور۔ اگر ہمیں درس قرآن کے لیے مواد چاہیے ہوتو انوارِ ربانی اور قول نبیؐ ہمارے لیے کافی ہیں۔ اگر حالات حاضرہ پر بات کرنا مقصود ہوتو خاص مضمون میں کئی اہم معاملات پر مفصل اور مدلل مواد موجود ہوتا ہے۔ ہمارے بتول کے افسانے تو ماشاء اللہ ایوارڈ کے لائق ہیں، وقت کی ضرورت کے عین مطابق۔ اللہ کریم اپنے مشن پر چلنے والوں پر الہام کرتے ہیں۔ ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنی مطلوبہ راہوں پر چلاتے ہیں۔ کیا ہی کہنا ان سعادت مند روحوں کا جو دنیا کو خدا اور اس کے رسولوں کا صحیح پیغام پہنچاتے ہیں۔ اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔

''کتابیں اپنے آبا کی'' میں ایک تلخ حقیقت پر بات کی گئی ہے۔ کاش کتابوں کو سنبھالنے کی بجائے ان کو عام کیا جائے۔ جو پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں ان کو بخوشی کتاب پیش کی جائے میں تو جمع کرنے کے اتنی خلاف ہوں کہ کتاب اور رسالے بھی جمع نہیں کر پاتی۔ اکثر خود کو بعد میں کمی محسوس ہوتی ہے کسی تحریر کو دوبارہ دیکھنا ہو تصدیق یا تبصرے کے لئے۔ ''خراج تحسین'' میں شمیم فاطمہ نے خواتین کے دکھوں کی صحیح عکاسی کی اور مردوں کو ان کا فرض یاد کروایا۔

عبدالمجید۔ راولپنڈی

زندگی کی شام آ پہنچی۔ یہ ملک جو اسلام کے نام پر اسلام کو چاہنے والوں کی قربانیوں سے حاصل ہوا ان لوگوں پر قبضے میں چلا گیا ہے جو فن اور کلچر کے نام پر بے حیائی کو فروغ دے رہے ہیں اور گھروں میں بیٹھے بیٹھے بھی آسانی سے ہر طرح کا مواد فراہم کرتے ہیں۔ یہی تاثر ملتا ہے کہ اس ملک کی پڑھی لکھی خواتین خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کیے بغیر نہ چھوڑیں گی۔

اس میں آپ کا یہ سادہ سا رسالہ، اس کے مضامین بغیر خواتین کی کسی ایسی تصویر کے جس میں مقصد خواتین کے حسن کی نمائش ہو......

یہ رسالہ مجھے دیا گیا اور پہلی بار ہی میں نے اس کو دیکھا اور پڑھا اور حیران ہوں کہ میں غلط سمجھ بیٹھا کہ سب خواتین ایسی ہوتی ہیں۔ یہی بات مجھے حیران کیے جاتی ہے کہ آپ کے رسالے میں وہ سب کچھ موجود ہے جو خواتین کی ضرورت ہونی چاہیے۔

اللہ پاک آپ کو اپنے مقاصد میں کامیاب کرے اور اسلامی انداز اور ذہن سے علم کو اس طرح پھیلانے کو بطور نیکی قبول فرمائے۔ آمین۔

☆☆☆

زیب اسد۔لاہور

فرزانہ چیمہ نے تو ہمیں شرمندہ کر کے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا کہ ہم بھی چلتے چلتے محشر خیال میں حصہ ڈالیں۔ خوبصورت تحریریں تو صائمہ اسما، ڈاکٹر مقبول شاہد، فرزانہ چیمہ، نصرت یوسف، آسیہ راشد، قانتہ رابعہ اور ثریا اسما کی ہوتی ہیں۔ ہم تو ٹھہرے نالائق لوگ!

ماریہ خانم اور فرزانہ چیمہ نے نومسلم مریم جمیلہ کی زندگی کی پوری تصویر دکھا دی ہے، بلاشبہ وہ ایک بہترین ماں، بہترین مصنفہ اور بہترین سوکن تھیں۔ شمیم فاطمہ نے اپنی آزاد نظم میں اگرچہ مشرقی پاکستان کی تصویر کشی کی ہے 16 دسمبر 1971ء کو سب لوگ بہت روئے تھے مگر اس میں ایک خاندان کی شبیہ دکھائی دیتی ہے۔ کہ کس طرح والدین اپنے بچوں کی تربیت، تعلیم اور شادی کرتے ہیں اور پھر بڑھاپے میں تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسے موڑ پر ہم اپنا راستہ تبدیل کرتے ہیں۔

ہم اپنے ہاتھ سے اس گھر کو پھر تقسیم کرتے ہیں۔

ہماری گفتگو کا ذائقہ میٹھا نہیں رہتا۔

ہماری خیر خواہی کا چلن ویسا نہیں رہتا

شکر ہے ''آنگن'' میں بہو واپس آ گئی۔ صبح کا بھولا واپس آ جائے تو وہ بھولا نہیں ہوتا۔ حمیرا خالد نے اچھا افسانہ لکھا ہے۔ قانتہ رابعہ نے گھر بیٹھے دوسرا حج کروا دیا ہے آسیہ راشد صاحبہ اتنے مہنگے خشک میوہ جات کیسے کھائیں؟ ڈاکٹر بشریٰ تسنیم نے آخرت کی شاپنگ کرا دی ہے۔ ایک اور قابل غور بات ہے کہ اکثر لوگ فوت ہونے کو چھین لینا کہتے ہیں (اللہ نے میرا بیٹا چھین لیا۔) اسکی امانتیں ہوتی ہیں۔ جب چاہے واپس لے لے۔ ایسا کہنا اللہ تعالیٰ کے خلاف شان ہے

☆☆☆

ساجدہ ناہید۔دبئی

لیجیے جی کیسی خوش نصیبی ہم دیار غیر میں بسنے والوں کی کہ آج ایک انتہائی عزیز ہستی کی وساطت سے دسمبر 2012ء کا بتول ہمیں 6 جنوری کو ہی مل گیا۔ اسی خوشی میں ایک ہی نشست میں سارے کا سارا فہرست سمیت پڑھ ڈالا۔ سو تبصرہ کرنا تو واجب ہوگیا (ہماری سمجھ میں)۔ لیجیے جناب تبصرہ حاضر ہے (ویسے ہم نومبر 2012ء کے پرچے کے تاحال منتظر ہیں۔ زہے نصیب)

اداریہ میں سیدنا علی حسینؓ ابن علیؓ کے کردار کو سلام ''غیروں کے الفاظ میں'' پڑھ کر بہت اچھا لگا

جبکہ ''اپنوں'' کی گواہیاں تو صدیوں سے جاری ہیں۔ اور تا قیامت جاری رہیں گی۔ جب کبھی کسی ظالم کے سامنے کوئی مظلوم حق لے کر کھڑا ہوگا، حسینؓ ابن علیؓ کو یاد کیا جاتا رہے گا۔

ادار یہ تو قاضی حسین پر قاتلانہ حملے کی خبر دے رہا ہے۔لیکن آج یہ کیا ہوگیا؟ قاضی صاحب تو اپنے، پرائے بلکہ پوری امت کو بھنور میں چھوڑ کر اپنے رب کے بلاوے پر اس کے حضور پیش ہو بھی گئے۔اتحاد بین المسلمین کا داعی، وہ جس کا سینہ امت کے درد سے لبریز اور جس کا دل اسی کے غم میں دھڑکتا تھا۔کیا زمین اسے بھی کھا گئی جس کے اخلاص کے سبب اپنے پرائے، دوست دشمن بلکہ پوری امت کے لیڈروں کا احترام کرتے تھے۔کیسی خوبصورت گواہی کسی نے پیش کی ہے اور میرے دل کی بھی یہی آرزو ہے کہ اپنے مقصد سے سچی وابستگی اور مسلسل جدوجہد نے انہیں وقار اور اعتبار بخشا، اسی اعتبار کے ساتھ وہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں چلے گئے۔عمر بھر کی بیقراری کو قرار آ ہی گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند کرے۔ان جیسا اب اور کوئی نہیں دکھتا۔

کیسا قحط الرجال کا دور ہے؟ محترمہ مریم جمیلہ کی رخصتی، پروفیسر غفور کا بچھڑنا۔ایک سے بڑھ کر ایک بڑی، بھاری اور نا قابل یقین خبر۔اے اللہ تو ہی رحمت کے سبب ان محرومیوں کی تلافی کے اسباب پیدا فرما کہ اپنے نبیؐ کی امت کی مدد فرما آمین۔

دعا کے موضوع پر ڈاکٹر مقبول احمد ہر مسلمان کی اس اہم ضرورت کو آسان الفاظ سے جس وضاحت سے پیش کر رہے ہیں وہ قابل تحسین ہے۔ امید اور خوف تو مومن کے دو پر ہیں جس کے ساتھ وہ زندگی بھر پرواز کرتا ہے۔کیا ایک پر کے ساتھ اڑ ناممکن ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ امید کے ساتھ خوف کی کیفیت موجود رہنی چاہیے تاکہ انسان گناہوں سے بچا رہے اور جب زندگی کی مہلت ختم ہو رہی ہو تو امید کا پہلو غالب رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

افشاں نوید قول نبیؐ کی روشنی میں دنیا کی بے ثباتی اور بے حقیقی پر روشنی ڈال رہی ہیں۔ میں اپنا اور ارد گرد کا جائزہ لیتی ہوں تو یوں لگتا ہے کہ ہماری زندگیوں میں سادگی نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔کیا سادگی اس بات کا نام ہے کہ جب اپنی خواہشات کو پورا کرنا افورڈ نہ کر سکتے ہوں تو سادگی اور سادہ زندگی اختیار کر لیں؟ اسی دسمبر میں پاکستان جانا ہوا۔ یہ جان کو تعجب

اور دکھ ہوا کہ دنیا دار کیا، دین دار کیا، سب ہی ایک رو میں بہے جارہے ہیں۔ بات تو یہ ہے کہ جب ہاتھ کھلا ہو تب ہی ""لاتُسْرِفُوْا والی آیت کو سمجھا جائے۔ سارا مضمون ہی بار بار پڑھنے اور اپنا جائزہ لے کر عمل کے لئے نکات لینے پر زور دیتا ہے۔

مرحومہ مریم جمیلہ کی پوری زندگی کا مختصر مگر جامع تعارف فرزانہ چیمہ نے بہت خوبصورتی سے پیش کیا۔ مرحومہ کی بیٹی ماریہ خانم بھی اپنی عظیم ماں کے روزمرہ کے حالات سے متعارف کراتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی ساری گواہیوں کو مرحومہ کے حق میں قبول فرمالے۔ یقیناً وہ اللہ کے راستے کی سچی مہاجرہ تھیں۔ ان کی تحریریں زندگیوں پر اثر انداز ہونے والی ہیں جو یقیناً ان کے لئے صدقہ جاریہ بنیں گی۔ ان شاءاللہ۔

گیلپ سروے کی جو تازہ تحقیق پیش کی گئی وہ مضمون ہی کے مطابق 2005ء کے سروے پر مبنی ہے۔ اس طرح یہ تحقیق سات سال پرانی ہے اگرچہ نیویارک ٹائمنر میں اب چھپی ہو، جبکہ گزشتہ سات سالوں میں پوری دنیا کی مسلم خاتون اپنی شناخت اور اپنے دین سے زیادہ قریب آگئی ہے۔ خواتین کے اندر بیداری کی ایک لہر ہے جسے عالمی سطح پر محسوس کیا جارہا ہے۔

حصہ نظم اچھا لگا۔ عنایت علی خان کی حمد حسب توقع بہت خوب ہے، شاہدہ سحر کا اپنی لخت جگر کو خراج پیش کرنا ایک ایک شعر محبت اور حقیقت کا ترجمان ہے۔

افسانوں کا حصہ کچھ سکڑا دکھائی دیا (صرف تین) شاید شدید سردی کے اثرات ہونگے۔ عالیہ حمید نے اپنی طویل کہانی میں مسجد اور امام کے حقیقی کردار کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ایسے صبر وتحمل اور حق گوئی کے کردار۔ آج کل کہاں ملتے ہیں۔ آج کل کے آئمہ مساجد اور خودساختہ جاہل علماء فرقہ واریت اور فتنہ کو فروغ دینے میں مگن ہیں۔ اوران کی عقل ناقص میں یہی خدمت دین ہے۔ اللہ کرے کہ امت کے حقیقی علماء اور رہبر منبر ومحراب کے کھوئے ہوئے مقام وکردار کو واپس لانے کے لیے اور اتحاد بین المسلمین کے لیے قاضی حسین احمد مرحوم ومغفور جیسا مثالی کردار ادا کرسکیں۔

آنگن میں حمیرا خالد پھوپھی ساس کے مثبت وتعمیری کردار کو بہت خوبصورتی سے پیش کرتی نظر آتی ہیں۔ گھرانوں کی آبادی اور امن وسکون کا بہترین نسخہ۔ مقدس رشتوں اور مقدس جذبوں کا احترام، بڑوں کی

وسعت قلبی بچوں کی غلطیوں سے صرف نظر اور درگزر۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ محبت اور خلوص کا سیمنٹ اور گارا ہی گھر کی دیواروں میں پڑنے والی دراڑوں کو جوڑنے کا کام دیتا ہے۔ گھر کے بڑوں کے دلوں کا بڑا ہونا ہی حقیقی وائٹ واش کا کام دیتا ہے۔

نصرت یوسف اپنے ناولٹ کی پہلی قسط میں ایک کمزور انسان پر اللہ تعالیٰ کی بے پناہ نعمتوں کے ساتھ ساتھ صرف ایک آزمائش پر ہی اپنے پروردگار سے شکوے کا حال اور خالق سے دوری پر اس کے دلی جذبات کا منظر روانی سے پیش کرتی نظر آتی ہیں۔ خوبصورت، بامقصد اور بامعنی جملے ان کی تحریر کا حصہ ہیں۔ لکھتی ہیں ''رمضان بھی نیکی کے طلب گاروں کو سیراب کرتا گزر گیا۔ عمر خیام نے عطا و بخشش کے خزانوں سے منہ موڑے ہی رکھا۔'' کہانی کا تسلسل اچھا ہے۔ دیکھئے انجام کیسا ہوتا ہے؟

نمایاں خواتین کے تذکرے میں ام جمیل کا ذکر ہے۔ گزشتہ شماروں میں ملت اسلامیہ کے درخشاں ستاروں (جو کہ ابھی ختم نہیں ہوئے) کے تذکروں کے بعد ایسی خواتین کے ذکر میں کوئی حرج نہیں ہے تاکہ عبرت و موعظت کا سامان ہو سکے۔ لیکن اگر ادارہ یا مصنفہ ایک وضاحتی نوٹ لکھ دیتیں کہ اب کس قسم کی خواتین کا تذکرہ پیش کیا جائے گا تو بہتر تھا۔

چلتے چلتے نے ہمیشہ کی طرح سوچوں کو چلتے پھرتے ہی رکھا۔ فرزانہ رواں اردو میں پنجابی کے جوڑ خوب لگاتی ہیں۔ پڑھ کر مزہ آتا ہے۔

قانتہ رابعہ کے سفر حج کی روداد پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ جیسے میں بھی ان کی ہمسفر ہوں۔ فریضہ حج کی ادائیگی کے دوران حجاج کی غفلتوں اور گرد و پیش نظر آنے والی کمی کوتاہی بڑے درد اور سوز سے بیان کرتی ہیں۔ سلامُ علی ابراہیم والا پیراگراف بہت ہی خوبصورت ہے۔

ڈاکٹر آسیہ شبیر کا بھلا ہو کہ انہوں نے مطالعہ گاہ میں لے جا کر کتاب کا تعارف تو خوب کرایا، لیکن جب کتاب کا نام اپنی خریداری کی فہرست میں لکھنا چاہا تو نہ کتاب کا نام معلوم ہو سکا۔ اور نہ مترجم و مصنف کے بارے میں کچھ پتا چلا۔ ممکن ہے کہ یہ میری ہی کوتاہ نظری ہو لیکن دوران مطالعہ میں نے چشمہ تو لگا رکھا تھا۔

خشک میوہ جات کی افادیت تحریر کر کے آسیہ راشد نے خوب صحت مندانہ مشورے دیے ہیں۔ اللہ انکو بہترین جزا دے مگر ہائے ہماری جیب! ایک دکان کے

سامنے سے گزرتے ہوئے ایک بڑی سی چنگیر میں خوبصورت چلغوزوں کا ڈھیر دیکھ کر خریدنے کا ارادہ کیا تاکہ حفظان صحت کے اصولوں پر کچھ ہم بھی عمل کر سکیں مگر قیمت معلوم کرنے پر چپ سادھ کر چلتے ہی بنی کہ ایک کلو چلغوزے چار ہزار روپے میں اور ایک کلو بادام ایک ہزار سے شروع ہو کر ایک ہزار نو سو تک۔

گوشہ تسنیم تو گویا بادِ نسیم ہے، بشریٰ تسنیم صاحبہ اپنے گرداگرد پھیلے بے شمار موضوعات میں سے ایسے توجہ طلب اور اچھوتے موضوع جانے کیسے ڈھونڈ لیتی ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ آج کی دنیا کا ہر فرد کیا مرد کیا عورت شاپنگ گلیمر کی چکا چوند سے بے حال ہے۔ کبھی تو یوں لگتا ہے نوجوان مرد عورتوں سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئے ہیں۔

(عورتوں کی تو یہ فطری کمزوری ہی سہی) کتنا سچا ہے یہ جملہ کہ ''شاپنگ کیلئے نکلنا تو ایک نشہ بنتا جا رہا ہے۔ پھر کیا نفع کا سودا ہے کہ فانی چیز کے بدلے فانی چیز ہی خریدی جا رہی ہے؟'' پھر وہ ایک انتہائی قیمتی اور نفع بخش شاپنگ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ''یہ شاپنگ آن لائن بھی ہو سکتی ہے۔ اس میں خیانت کا کوئی خطرہ نہیں کیوں کہ امین ہستی سے معاملہ ہے۔ کوالٹی کی گارنٹی ہے۔ نفع اور بھرپور نفع کا یقین ہے۔''

رفعت اشتیاق۔ گوجرہ

دل نے کہا اے پاک طینت، پاک باز اے عورت تیری عظمت کو سلام، ماریہ خانم کی والدہ محترمہ مریم جمیلہ صاحبہ کے بارے میں پڑھ کر پہلی بار اپنے عورت ہونے پر فخر محسوس ہوا۔ زندگی کی آزمائشیں کم نظر آنے لگیں۔ کیا ہی اچھا ہوا گر مریم جمیلہ صاحبہ کی تحریریں بتول کی زینت بنیں۔ اس دفعہ شاہدہ اکرام صاحبہ نے محشر خیال میں حشر بپا کر دیا۔ اتنا لمبا تبصرہ! ماشاء اللہ شاہدہ اکرام صاحبہ ہمارا بتول ۴۲ سال کا ہو گیا ہے (جی نہیں ۵۵ سال کا) موجودہ ادارتی ٹیم اور ماضی میں جن لوگوں نے اس پودے کو لگایا اور سینچا سب ہی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ باجی فرزانہ کا شکوہ بھی بجا ہے محشر خیال دن بدن چھوٹا ہوتا جا رہا ہے ہمیں توجہ دینی چاہیے لہٰذا شاہدہ صاحبہ نے تو چار صفحات پر مشتمل تبصرہ لکھ کر اس کی تلافی کی کوشش کی ہے اور ہم جو پیچھے رہنے والے ہیں انہیں تو بتول ملتا ہی بہت دیر سے ہے۔

اب بات ہو جائے قانتہ رابعہ کے سفرِ سعادت کی

۔نجانے وقت حضوری کو کتنی دفعہ پڑھا ہر دفعہ روح کو نئی طمانیت ملی۔ دل کی بات کتنی خوبصورتی سے کہہ دیتی ہیں لکھتی ہیں ''تعلق باللہ کی جو کیفیت مطلوب تھی وہ قطعی مفقود تھی۔ چودہ سو سال قبل کے حج میں یہ دنیا نہیں تھی۔'' مزید لکھتی ہیں ''بچپن سے کان اس ننھے منے لفظ سے مانوس تھے۔ اکثر ذہن میں سوال اٹھتا، منیٰ میں وہ کیا خاص بات ہے کہ اللہ نے اس کو ''خاص اسٹیشن بنادیا'' سارے تجزیئے کے بعد لکھتی ہیں ''ہوسکتا ہے عرشِ الٰہی یہیں نازل ہو۔ اس خیال کے بعد منیٰ کی سڑکیں، راستے سب ایک طرف رہ گئے بس ذہن میں عرش الٰہی کا تصور تھا۔''

شمیم فاطمہ کا ''گھر کیسے تقسیم ہوا'' سقوط ڈھاکہ کی یاد تازہ کر گیا۔ دلِ ناتواں وہ سب کیسے بھول سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پاک سرزمین کو تا ابد قائم ودائم رکھے آمین۔ ''میری لائبریری سے'' زیرِ تبصرہ کتاب کا نام اور ملنے کا پتہ نہیں لکھا گیا۔

ریحانہ کوثر۔لاہور

بتول پر تبصرہ لکھنے کو ہر ماہ دل چاہتا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ ہم بتول کا انتظار کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو بتول صاحب تشریف لاتے ہیں۔ بتول کی ایک ایک چیز کو دو دو مرتبہ بلکہ بعض مضامین کو میں کئی مرتبہ پڑھتی ہوں اور اہم چیزوں کو نوٹ بھی کرتی ہوں۔

بتول نا صرف ہمیں روحانی غذا فراہم کرتا ہے بلکہ یہ اس مصروف دور میں ملاقات کا آسان ذریعہ ہے۔ بہت سے ساتھی جو زندگی کے مختلف مرحلوں پر بچھڑ گئے ان کے نام اور تحریریں دیکھ کر دل ایک انجانی خوشی سے جھوم اٹھتا ہے۔ پیارے ساتھی اور ان کی صورتیں، سیرتیں نگاہوں میں گھوم جاتی ہیں اور ماضی کے خوبصورت دنوں کی سیر کرا لاتی ہیں۔

☆☆☆

مشترک بات کی طرف

انسانوں نے اپنے ہاتھوں اس کرۂ ارض کو فساد سے بھر دیا ہے۔ جائے امن کہیں نظر نہیں آتی۔ فرد ہو، گھر یا معاشرہ، بحر و بر کا ہر حصہ، سکون سے عاری ہے۔ ظلم کا دور دورہ ہے۔ دل ہوں یا ذہن طمانیت عنقا ہے۔ جو جتنا امن کا دعوے دار ہے وہ ظلم کے طریقہ پہ کاربند ہے۔

باہمی تنازعات نے رشتوں اور ملکوں اور انسانوں کو جنگل کا باسی بنا دیا ہے۔ آدم کی اولاد باہم دست و گریبان ہے۔ انسانوں کو اپنا انسان ہونا بھول رہا ہے...... اولاد آدم کو کسی ایسے کلمے کی ضرورت ہے جو اس کو فساد فی الارض سے روک سکے۔ ایک باپ کی اولاد پہلے کسی ایک نقطہ پر، کسی پلیٹ فارم پر جمع ہو کر بات تو کرے...... کہ مسئلہ کیا ہے؟ اور اس کا حل کیا ہے؟

باہم تنازعہ دو افراد کا ہو یا دو قوموں کا رب کائنات نے باہمی امن کا ایک ہی طریقہ سکھایا ہے۔ اسی پر عمل کرنے سے معاملات چھوٹے ہوں یا بڑے سلجھائے جا سکتے ہیں۔ مفاد مشترکہ کون سے ہیں؟ کون سے نکات میں تنازعہ نہیں ہے؟ دونوں کے کون سے مقاصد ایک جیسے ہیں؟ اگر کوئی ایک فائدہ مشترکہ ہو...... ایک نکتہ غیر متنازعہ ہو، کسی بھی ایک مقصد میں یکسانیت ہو تو بڑے سے بڑے فساد کو امن میں بدلا جا سکتا ہے، ٹوٹتے گھروں کو بچایا جا سکتا ہے...... ظالم کو ظلم سے روکا جا سکتا ہے۔ پڑوسی چاہے گھر کا ہو یا ملک کا، شر سے بچا جا سکتا ہے۔ اسی تربیت سے باہم معاہدے کیے جا سکتے ہیں۔ جب ساتھ بیٹھ کر بات شروع ہو جائے تو تنازعات پہ بھی افہام و تفہیم ہو سکتا ہے۔

اللہ کو ایک ماننے والوں کے درمیان کون کون سے تنازعات ہیں؟ بہت سے ہوں گے...... مگر ایک نکتہ ''اللہ کا ایک ہونا'' مشترکہ تو ہے نا! ہم دنیا کے امن کی بات کرتے ہیں۔ اتحاد بین المسلمین کی باتیں کرتے ہیں۔ بڑے بڑے سیمینار کرتے اور ان میں دھواں دار تقریریں کرتے اور سنتے ہیں۔ انسانی حقوق کے

دعوے دار ادارے ڈھکے چھپے کس طرح انسانوں کا ہی استحصال کرتے ہیں۔ دنیا میں امن قائم کرنے کے ذمہ دار توحید کو ماننے والے ہیں......مگران میں ہی کہاں کہاں کس قدر معمولی معمولی باتوں میں فساد ہیں ۔ سوچ کر ندامت ہوتی ہے۔مومن جس کا معنی ہی امن والا ہے......امن قائم کرنے والا......امن میں آ جانے والا......دوسروں کو امن میں رکھنے والا......اعتماد کرنے والا، اعتماد دینے والا ......مگر المیہ یہ ہے کہ مومنوں کو اپنے کلمہ گو بھائیوں سے نہ امن مل رہا ہے نہ مومن با اعتماد بنتا ہے۔ فروعی مسائل ...... اپنی جماعت، اپنا طریقہ، اپنا ملک، اپنا علاقہ، اپنی قوم، اپنی اپنی علم کی ڈگری، اپنا جھنڈا، اپنی سوچ اور اپنی انا کا زعم......ختم نہیں ہوتا۔

دنیا اس لیے فساد سے بھر گئی ہے کہ جن کو ایک کلمہ کے جھنڈے تلے جمع ہونا تھا وہ فرقوں میں بٹ گئے ......اگر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل کتاب کے سامنے ایک کلمہ رکھ کر امن وسکون قائم کرنے کا طریقہ بتایا تھا تو کیا فرقوں، ملکوں، قومیتوں اور جماعتوں میں بٹے ہوئے مسلمان اس طریقہ کو نہیں آزما سکتے؟......دنیا میں امن قائم کرنے کا فریضہ تو اسی ملت کو ودیعت کیا گیا تھا جو خود فساد فی الارض میں شامل ہو گئی ہے اور غیروں کی طرف دیکھ رہی ہے کہ ان کے گھر آ کر امن قائم کر دے......وہ اتنے غیر ہیں کہ ان کے ساتھ تو تعلقات رکھنے کے خاص قواعد بتائے گئے۔ وہی ایک بنیادی قاعدہ کہ جو ہمارے ساتھ اس نکتہ پہ اتفاق کرے تو وہ دنیا میں امن قائم کرنے کے لیے ہمارے ساتھ آ جائے ...... افسوس! کہ یہ نکتہ کلمہ گو مسلمانوں کے سامنے رکھنا پڑ رہا ہے۔

’’آؤ اس بات کی طرف جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گے۔‘‘ (آل عمران ۶۴)

☆☆☆

ایک کپ کافی دیوار پر

ہم دونوں دوست، پانیوں اور روشنیوں کے شہر وینس کے ایک نواحی قصبے کی مشہور کافی شاپ پر بیٹھے ہوئے کافی سے لطف اندوز ہورہے تھے کہ اس کافی شاپ میں ایک گاہک داخل ہوا جو ہمارے ساتھ والی میز کو خالی پا کر یہاں آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے بیٹھتے ہی بیرے کو آواز دے کر بلایا اور اپنا آرڈر دیا۔ دو کپ کافی لاؤ، اور اس میں سے ایک وہاں دیوار پر۔

ہم نے اس شخص کے اس انوکھے آرڈر کو دلچسپی سے سنا۔ بیرے نے آرڈر کی تعمیل کرتے ہوئے محض ایک کافی کا کپ اس کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ وہ ایک کپ نوش کیا مگر پیسے دو کے ادا کئے۔ اس صاحب نے کافی کا گاہک کے جاتے ہی بیرے نے دیوار پر جا کر ورقہ چسپاں کر دای جس پر لکھا تھا، ایک کپ کافی۔

ہمارے وہاں بیٹھے بیٹھے دو اور گاہک آئے جنہوں نے تین کپ کافی کا آرڈر دیا، دوان کی میز پر اور ایک دیوار پر، پیئے تو انہوں نے دو ہی کپ، مگر ادائیگی تین کپ کی کی اور چلتے بنے۔ ان کے جانے کے بعد بھی بیرے نے ویسا ہی کیا، جا کر دیوار پر ایک ورقہ چسپاں کر دیا جس پر لکھا تھا، ایک کپ کافی۔

ایسا لگتا تھا یہاں ایسا ہونا معمول کی بات ہے مگر ہمارے لئے انوکھا اور نا قابل فہم تھا۔ خیر، ہمیں کونسا اس معاملے سے کچھ لینا دینا تھا، ہم نے اپنی کافی ختم کی، پیسے ادا کئے اور چلتے بنے۔

چند دنوں کے بعد ہمیں ایک بار پھر اس کافی شاپ پر جانے کا اتفاق ہوا۔ ہم بیٹھے کافی سے لطف اندوز ہورہے تھے کہ یہاں ایک ایسا شخص داخل ہوا جس کے کپڑے اس کافی شاپ کی حیثیت اور یہاں کے ماحول سے قطعی میل نہیں کھا رہے تھے۔ غربت اس شخص کے چہرے سے عیاں تھی۔ اس شخص نے بیٹھتے ہی پہلے دیوار کی طرف دیکھا اور پھر بیرے کو بلایا اور کہا ایک کپ کافی دیوار سے لاؤ۔ بیرے نے اپنے روایتی احترام اور عزت کے ساتھ اس شخص کو کافی پیش کی جسے پی کر یہ شخص بغیر پیسے دیئے چلتا بنا۔ ہم یہ سب کچھ حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ بیرے نے دیوار پر لگے ہوئے ورقوں میں سے

ایک ورقہ اتار کر کوڑے دان میں پھینک دیا۔ اب ہمارے لئے اس بات میں کچھ چھپا نہیں رہ گیا تھا، ہمیں سارے معاملے کا پتہ چل گیا تھا۔ اس قصبے کے باسیوں کی اس عظیم الشان اور اعلیٰ انسانی قدر نے ہماری آنکھوں کو آنسوؤں سے بھگو کر رکھ دیا تھا۔

کافی نا تو ہمارے معاشرے کی ضرورت ہے اور نا ہی ہمارے لئے واجبات زندگی طرح کی اہم کوئی چیز۔ بات تو صرف اس سوچ کی ہے کہ کسی بھی نعمت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے آپ ان لوگوں کا تصور ہی کر لیں جو اس نعمت کو اتنا ہی پسند کرتے ہیں جتنا کہ آپ مگر وہ اس کے حصول سے محروم ہیں۔

اس بیرے کے کردار کو دیکھئے جو صاحب حیثیت لوگوں اور ضرورتمندوں کے درمیان رابطے کا کردار نہایت خندہ پیشانی اور کھلے دل کے ساتھ لبوں پر مسکراہٹ سجائے کر رہا ہے۔

اس ضرورتمند کو دیکھئے جو اس کافی شاپ میں اپنی عزت نفس کو مجروح کئے بغیر ہی داخل ہوتا ہے اور اسے یہ پوچھنے کی قطعی ضرورت پیش نہیں آئی کہ آیا اس کو ایک کپ کافی مفت میں مل سکتا ہے یا نہیں۔ اس نے دیوار پر دیکھا، کافی کا آرڈر موجود ہے، اپنے لئے ایک کپ کا آرڈر دیا، کافی کو سرور کے ساتھ پیا اور خاموشی سے چلتا بنا۔

جب ہم اس مذکورہ بالا کہانی کی جزئیات کو جانیں گے تو ہمیں اس کہانی کے کرداروں کے ساتھ ساتھ اس دیوار کے کردار کو بھی یاد رکھنا پڑے گا جو اس قصبے کے دردِ دل رکھنے والے باسیوں کی عکاس بنی ہوئی ہے۔

(انتخاب: ڈاکٹر فرح فاروق، استفادہ انٹرنیٹ)

☆☆☆